چراغ آفریدم
انشائیے
ناصر عباس نیر
BEACON BOOKS

فدوی کبھی

بھی اس کتاب کو اس شکل میں
جو آپ کے سامنے موجود ہے
مرتب نہ کر پاتا اگر نہایت ہی
زیرک اور ہونہار سکالر
سدرہ طاہر کی طرف سے اس
کی ترغیب نا دی جاتی اور اس
کے لیے مطلوبہ تصاویر بھی
محترمہ نے بھیجیں اس لیے میں
ان کا شکر گزار ہوں
رب عظیم انہیں سلامت رکھے

عبداللہ عتیق(iiui)

03478848884

3:02 PM

چراغ آفریدم

(انشائیے)

ناصر عباس نیّر

E-mail:beaconbooks786@gmail.com
Web: www.beaconbooks.com.pk

اشاعت : 2014ء

عبدالجبار نے
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/190 روپے

ISBN : 978 - 969 - 534 - 270 - 1

وزیر آغا کے نام

فہرست

☆☆☆

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم!

غور کریں تو انشائیہ واحد صنفِ ادب ہے جو صحیح معنوں میں شرفِ انسانی کی ترجمان اور محافظ ہے ۔ پیشِ نظر رہے کہ شرفِ انسانی کا کلاسیکی مفہوم اب باقی نہیں رہا جس کی رُو سے انسان اس لئے افضل ہے کہ وہ باقی مخلوقات کو مطیع اور مغلوب کر سکتا ہے یا ستاروں پہ کمند ڈال سکتا ہے۔ عظمتِ آدم کے اس تصور کی بنیاد اصلاً حصول طاقت و اختیار کی خواہش تھی ۔ اس خواہش کی تکمیل سے انسان نے اپنی زندگی کو غیر معمولی آسائشوں سے تو مزین کیا اور بہت سے محالات کو ممکن بھی بنایا جن کی بنا پر وہ فخر و تکبر کر سکتا ہے مگر انسان کو لاحاصلی کے ایک المناک احساس سے بھی دوچار ہونا پڑا ۔ گویا یہ ساری آسانیاں اور کامیابیاں نفسِ انسانی کے اس مرکزے کو مسرت بہ کنار نہیں کر سکیں جس میں تمام تجربات کا جوہر سمٹا ہوتا ہے ۔ چنانچہ حساس اذہان کو انسانی شرف و فضیلت کے اس تصور پر نظرِ ثانی کرنا پڑی ہے اور اب انسان کا اصل شرف یہ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ خود اپنی ایک کائنات تخلیق کر سکتا ہے ۔ (گویا کلاسیکی تصور شرفِ تسخیرِ کائنات اور جدید تصور تکمیلِ ذات سے عبارت ہے) ۔ استرداد اور تخلیق کا یہ مرحلہ وار عمل محض انسانی اَنا اور خودداری کا شاخسانہ نہیں بلکہ یہ خودِ آگاہی اور ماوراشناسی کا ایک ثمرِ شیریں ہے ۔

اِنشائیے کی تخلیق خود اپنی ایک نئی کائنات تخلیق کرتا ہے ۔ انشائیہ موجود جہانِ معنی پر قناعت نہیں کرتا ۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ جہان بنظرِ انشائیہ فرسودہ ہے اور یوں آگہی کے سفر میں رکاوٹ ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ محدود ہے ۔ حقیقت کے بس چند پہلوؤں کو منکشف کرتا ہے، اور یہ بات شرفِ انسانی کے لئے باعثِ ننگ ہے کہ فرسودہ، محدود اور بخشے ہوئے جہانِ معنی پر راضی اور قانع ہوا جائے ۔ انشائیہ معانی کا ایک تازہ اور نیا عالم خلق کر کے انسانی فضیلت اور خودی کی

محافظت کرتا ہے۔ گویا انشائیے کا تخلیقی عمل دو اہم مراحل سے عبارت ہے۔ اول یہ آگہی کہ اشیا کے مروجہ تصورات ابتدائی اور اوریجنل انسانی تجربے کے زندہ لمس سے محروم ہو کر بے جان ہو چکے ہیں۔ دوم اس آگاہی کی بنا پر ایک نئی آگہی تخلیق کرنا۔ غور کریں تو یہ دونوں مراحل شرف انسانی کے اظہار و اثبات میں معاون ہیں۔

دیکھا جائے تو دیگر اصناف ادب آئینے کی مثل ہیں جب کہ انشائیہ چراغ کی مانند ہے۔ اوّل الذکر منعکس کرتی ہیں مگر آخر الذکر منور کرتا ہے۔ دوسری اصناف نقل کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے بالعموم اسی کی عکاسی کرتی ہیں جو پہلے سے بالکل سامنے موجود ہوتا ہے۔ جب کہ انشائیہ نہ صرف سامنے کے غائب اور اوجھل گوشوں کو روشن کرتا ہے بلکہ ناموجود کو موجود اور محسوس بناتا ہے۔ اس تقابل سے دوسری اصناف کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ ان کی حدود کو اجاگر کرنا مطلوب ہے۔ انشائیے کے علاوہ نظم ونثر کی اصناف ناموجود کو مس کیے بغیر بھی کام چلا لیتی ہیں مگر انشائیہ معنی تازہ کی تخلیق کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ انشائیے کے لیے چراغ کی تمثیل لانے میں ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ یہ بنی نوع انسان کی اس قوتِ تخلیق وایجاد کا استعارہ ہے جس کے طفیل وہ اپنی عنصری خرابیوں اور تخریبی کارروائیوں کے باوجود اشرف المخلوقات ہے۔

انشائیہ چونکہ خیال کی چمک اور معنی کے کوندے سے نسبتاً زیادہ سروکار رکھتا ہے، اس لیے یہ غلط فہمی اکثر پیدا ہوئی ہے کہ انشائیہ زمین، جسم اور عصر سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انشائیہ اپنے تخلیقی تقاضوں کے تحت ان تینوں کو اس طور پر اپنے دامن دِل کو جگہ نہیں دیتا، جس طور نظم ونثر کی باقی اَصناف انھیں اپنے سینے سے لگاتی ہیں۔ انشائیہ اَرض اور عصر کو اِس حد تک ضرور درخورِ اعتنا جانتا ہے کہ اس کی تخلیقی سطح برقرار رہے۔ ہر تخلیقی صنف، مواد اور معنی کی ثنویت پر مبنی ہوتی ہے۔ (گو عمل تخلیق کی اوریجنلٹی اِس اَمر میں ہوتی ہے کہ مواد اور معنی یوں گتھم گتھا ہو گئے ہوں کہ ان کی ثنویت کو نمایاں کرنا محال ہو) مواد کثیف اور معنی لطیف ہے۔ اسے اُصولِ فطرت کہیے یا ہمارے نشانیاتی نظام کا جبر کہ لطافتِ معنی کا جلوہ کثافتِ مواد کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ معنی اپنے قیام اور استقرار کے لیے بہر حال مواد (ارض+عصر) کا دست نگر ہے۔

جس طرح انسان کا ذہنی اور روحانی ارتقا، تجسیم سے تجرید اور جذبے سے خیال کی سمت سفر کا نام ہے، اسی طرح ادب کا جب اِرتقا ہوتا ہے تو ایسی اصناف وجود میں آتی ہیں، جن میں

(مواد کا) تجسیمی اور کثافتی عنصر بتدریج گھٹتا چلا جاتا ہے: خیال، معنی اور تجرید کی سطح بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس حوالے سے انشائیہ ادب کی انتہائی ترقی یافتہ صنف ہے اور انسان کے موجودہ ذہنی اِرتقا سے ہم آہنگ ہے۔ چناں چہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک پختہ اور تربیت یافتہ ذوق و ذہن کی ضرورت ہے۔ انشائیہ معنی کی جس نئی کائنات کو وجود میں لاتا ہے، وہ قدرے اجنبی اور نامانوس ہوتی ہے۔ گو وہ انسانی صورتِ حال سے لاتعلق نہیں ہوتی مگر معنی کے ایک ہی رُخ پر مر مٹنے والے لوگ انشائیے میں موجود نامانوسیت پر جھلا اٹھتے ہیں اور اسے اپنے روزمرہ شعور پر ضرب کاری سمجھتے ہیں۔ انشائیہ اپنے قاری سے ذہن وظرف کی کشادگی اور نظریاتی رواداری کی توقع رکھتا ہے اور اپنے قاری کو ایک اعلیٰ درجے کی مسرت فراہم کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

اردو میں انشائیے کے فروغ میں وزیر آغا کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آج ہم اردو انشائیے کی حدود اور مزاج کو لائٹ یا پرسنل ایسے کے انگریزی نقادوں کے حوالوں سے بغیر بڑے اعتماد کے ساتھ معرض بحث میں لاتے ہیں تو اس کے پیچھے وزیر آغا کی بصیرت انشائیہ کارفرما ہے۔

مجھے اپنے انشائیوں کے سلسلے میں کچھ اور احباب کا ذکر بھی کرنا ہے: اول محمد شفیع بلوچ مرحوم، وہ میرے پہلے دوست تھے جنھوں نے اپنے نام میرے خطوط سے یہ اندازہ لگایا کہ مجھ میں انشائیہ نگاری کا جوہر موجود ہے اور مجھے انشائیہ لکھنے کی تحریک دی۔ ڈاکٹر پرویز پروازی میرے استادِ مکرم ہیں، جب میں (۱۹۸۸ء) گورنمنٹ کالج 'فیصل آباد' میں ایم اے اردو، سال اول، میں تھا تو اپنا پہلا انشائیہ ''نے موسموں کی ہوا'' انھی کو دکھایا تھا اور انھی کے مشورے سے ''اوراق'' کو بھیجا تھا۔ میں ہمیشہ ان کا ممنون رہا ہوں۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں کاغذی پیرہن، لاہور سے شایع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن برادرم الیاس کبیر کی کاوش سے بیکن ہاؤس، ملتان سے چھپ رہا ہے۔ ان کا شکریہ۔ گزشتہ چودہ برس میں فقط آٹھ انشائیے لکھ سکا ہوں، جنھیں اسی کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

۱۱ر مارچ ۲۰۱۴ء

ناصر عباس نیرّ
شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کمرہ

کمرے سے میری دلچسپی کا آغاز اس لمحے ہوا جب کتاب کی محبت میرے رگ وپے میں بس گئی۔ کتاب کی محبت کسی گھبرو کے پہلے پیار کی طرح متعدد تقاضے کرتی ہے۔ سب سے پہلے تو دنیا کے اس آئین کو تج دینے کی فرمائش ہوتی ہے، جس نے آپ کو، یعنی آپ کے اقوال واعمال کو بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ آپ ایک طویل وعریض قافلے میں بے نام ونشاں ہوکر ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے بارے میں قافلے کے دیگر مسافروں کی طرح آپ کا علم بھی صفر تھا۔ کتاب کی محبت میں آپ قافلے سے الگ ہوجاتے ہیں، چپکے سے، اور ایک ایسے ماحول میں آبستے ہیں جہاں کما حقہ کتاب کے ناز اٹھائے جاسکیں۔ کتاب کے ناز اٹھانا، دلھن کے ناز اٹھانے کی طرح ایک پر لطف اور تخلیقی سرگرمی ہے، اور ہر تخلیقی عمل خلوت کا طلبگار ہے۔ کتاب دوستی نے مجھے جن تخلیقی لحات کی چاٹ لگادی تھی، ان کے حصول کے لیے مجھے کمرے کی فضا بے حد راس آئی، کیوں کہ یہاں معطر تنہائی ہر وقت میرے لیے چشم براہ تھی۔ یوں مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کمرہ انسان کا ایک با اعتماد رفیق ہے۔ کمرہ انسان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے بے تاب رہتا ہے، مگر یہ پہل کبھی نہیں کرے گا کہ اس کی خودداری اس قسم کے اقدام سے اسے باز رکھتی ہے۔ تاہم آپ جوں ہی اس کے اندر جھانکنے کی راہیں تلاش کرلیں گے یہ ایک سچے اور مخلص دوست کی طرح اپنا سب کچھ آپ کے سامنے چُن دے گا۔ یوں آپ حیرت اور مسرت کے نایاب لمحے سے معانقہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

کمرے کی اصل کائنات اس کا فرنیچر، دیواروں پر آویزاں پینٹنگز یا تصاویر، الماریوں میں صف باندھے ہوئے کتابیں اور دیگر سامان نہیں ہے، بلکہ کمرے کی حقیقی کائنات وہ منفرد احساس اور فضا ہے جو اس بھری کائنات میں کہیں اور میسر نہیں۔ اس مخصوص احساس اور فضا کو غالبًا سب سے پہلے اس آدم زاد نے دریافت کیا ہوگا جس نے جنگل کو خیر باد کہہ کر کمرے میں پہلی رات بسر کی ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے، وہ پوری رات سو نہ سکا ہوگا۔ ایک تو تحفظ میں آکر وہ نیند اڑا دینے والی خوشی محسوس کرتا ہوگا، دوسرے درختوں کی کثرت اور نظروں سے آسمان کے اوجھل ہو جانے کی بنا پر اس کی سوچ کا رخ اپنی ذات کی طرف منعطف ہو گیا ہوگا، اور شاید تاریخ انسانی میں روحانی سفر کا آغاز کمرے کی تعمیر ہی سے ہوا ہے۔ (غار بھی کمرے کی ابتدائی شکل ہی تو ہے)۔ کمرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے وہ خاص ماحول اور فضا مہیا کرتا ہے جو معارفِ ذات و کائنات جاننے کے لیے اسی قدر ضروری ہیں، جس قدر نباتاتی زندگی کے لئے سورج کی حرارت! خالص جسمانی سطح کی مصروفیات روحانی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ آدمی جوں ہی جسمانی تقاضوں کی شدت سے (شریفانہ انداز میں) خلاصی پاتا ہے ذہنی اور روحانی وارداتیں اس کے فکر و احساس پر طاری ہونے لگتی ہیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی جنگل کے باسی نے اپنی جسمانی کاوشوں کی زنجیر کا ایک سلسلہ ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا ہوگا۔ اس طرح وہ ہَولے ہَولے روحانی واردات کی اس پری کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا، جسے جنگل میں رہنے والے انسان نے کبھی خواب میں دیکھا تھا۔ اس کا یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا اور اس کے نقوش اتنے گہرے اور اَن مِٹ تھے کہ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی انسان حقیقت کے رُخِ زیبا کی زیارت کے لیے کمروں میں (جو حجرہ نما ہو سکتے ہیں) تپسیا کرنے سے باز نہیں آیا۔ بات یہ نہیں کہ روحانی حقائق کمرے کی کھڑکی یا روشندان میں سے اسے نظر آ سکتے ہیں۔ دراصل جن کمروں کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، ان میں کھڑکیاں اور روشندان تو سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے۔ کھڑکیاں اور روشندان تو کمرے کے اندر کی خاص کائنات کو باہر کی عام دنیا سے جوڑنے کے لیے رکھے جاتے ہیں اور وہ اوّلین انسان جو کمرے میں آکر ایک انوکھی روحانی کیفیت سے سرشار ہوا ہوگا، اس نے کمرے کو کھڑکیوں اور روشندانوں سے عاری رکھا ہوگا۔ کمرے کے بدن پر یہ دونوں پھوڑے بعد میں نمودار ہوئے ہوں گے۔ جنگل میں طویل مدت تک رہنے سے انسان باہر کی فضا سے اتنا مانوس ہوا

کہ وہ اس کی یاد کو دل سے محو نہ کر سکا۔ کمرے کو کھڑکیاں اور روشندان عطا کر کے انسان نے اپنی جنگلی ذہنیت ہی سے ہم رشتہ ہونے کی کوشش کی ہوگی۔

روحانی کیفیتوں کا ماخذ کمرہ نہیں، انسان خود ہے۔ کمرہ صرف وہ فضا مہیا کرتا ہے جو روح کے اسرار کو بے نقاب ہونے پر اکساتی ہے، اور یہ فضا بجز اس احساس کے کچھ نہیں کہ آپ چند ثانیوں کے لئے خارج سے فکر واحساس کی سطح پر منقطع ہو جائیں اور بن پیے جھومنے لگیں۔ میں اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر اور کتاب تھام کر روزمرہ کے بوجھل معمولات کو تیاگ دیتا ہوں، یعنی اپنے معمولات سے چپکنے کے بجائے انھیں خاص فاصلے سے دیکھنے لگتا ہوں اور مجھ پر (بزعم خویش) عرفان وآگہی کی بارش ہونے لگتی ہے۔

کمرہ بلاشبہ جسمانی سرگرمیوں کو معطل کر کے ایک طرف فکر واحساس کی نئی قندیلیں فروزاں کرنے کا باعث بنتا ہے تو وہ دوسری طرف ذہنی اذیت بھی پہنچاتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف صوفیوں اور ولیوں کا گہوارہ رہا ہے تو دوسری طرف ان خطرناک مجرموں کے لئے کال کوٹھڑی بھی بنا ہے، جو اپنے خون کی تیز گردش کے ہاتھوں شقی القلب بن جاتے اور عالم پر قہر برساتے ہیں۔ تاہم قیدی اگر کمرے سے رشتۂ محبت استوار کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو کمرہ رحمت کی برکھا سے اسے شرابور بھی کر سکتا ہے۔ یہاں مجھے ایک انگریزی فلم کا وہ ہیرو یاد آ رہا ہے جسے کئی افراد کے قتل کے جرم میں پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ اسے کئی برس قیدِ تنہائی میں گزارنے پڑے۔ وہ اپنے زنداں کی دیواروں میں نقب تو نہ لگا سکا تاہم اپنی تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لیے اس نے زنداں کے روشن دان میں سے آنے والی چڑیوں سے دوستی قائم کر لی۔ اس نے خود کو میزبان تصور کیا اور چڑیوں کی تواضع کیڑوں مکوڑوں سے کرنے لگا جنھیں وہ کافی محنت سے گھیر گھار کے پکڑتا۔ چڑیاں جب اس سے مانوس ہو گئیں اور بے تکلف اس کے پاس آنے لگیں تو وہ ان کی حرکات وسکنات کو گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ اس عمل سے اسے حیرت انگیز انکشافات ہوئے جنھیں اس نے کتابی صورت میں قلمبند کرنا شروع کر دیا اور یہ کتاب چڑیوں کے موضوع پر ایک وقیع تحقیقی مقالہ بن گئی۔ اگر ایک الگ تھلگ کمرے میں قیدِ تنہائی کی سزا نہ دی جاتی تو وہ اتنا بڑا کام کبھی نہ کر سکتا، زندہ باد کمرہ! اس موقع پر مجھے چیخوف کے افسانے ''شرط'' کا وکیل ہیرو بھی یاد آ رہا ہے، جس نے معمولی سی بات پر شرط بد کر ایک علیحدہ کمرے میں پندرہ برس گزار دیے۔ جب وہ

شرط کے تحت مقرر کی گئی قیدِ تنہائی کو جھیل چکا اور ایک بھاری رقم جیتنے کا مستحق ٹھہرنے والا تھا تو صرف چند گھنٹے پہلے کمرے سے بھاگ گیا، اور یوں بھاری رقم کو لات ماردی کہ کمرے کے طویل قیام نے اس پر زندگی کا ایک دوسرا معنی منکشف کردیا تھا۔ اس کی نظر میں سماجی زندگی کے مناصب و مراتب کا سر بفلک بُت بالکل بکھر کر رہ گیا تھا۔ مجھے کئی ایسی باغی رہنما بھی یاد آرہے ہیں جنھیں حکومت نے پابندِ سلاسل کیا مگر جب وہ باہر نکلے تو پہلے سے زیادہ طاقتور بن چکے تھے۔ یوں دیکھیے تو کمرے میں نئی دنیا ئیں اور نئے عالم تخلیق کرنے کے اسباب مہیا ہیں اور کسی مردِ دانا کے منتظر رہتے ہیں!

کمرہ اس بسیط کائنات کو ایک خاص فاصلے سے دیکھنے کا مقام ہے۔ کمرے سے باہر خارجی طلسم آپ پر پوری طرح مسلط ہوتا ہے۔ یہ تسلط نفسانی جذبے کی سی شدت کا حامل ہے، اس لیے آپ کے فکر و نظر پر دبیز دھند چھاجاتی ہے اور اشیا، مظاہر اور واقعات اپنی اصل صورت میں نظر نہیں آتے۔ انھیں ان کے اصلی تناظر میں دیکھنا اور پہچاننا ایک خاص فاصلے کا متقاضی رہتا ہے۔ مثلاً جب آپ صبح کے منظر کے ناظر بنتے ہیں تو آپ احساس کی سطح پر خوش تو ہوسکتے ہیں مگر صبح اپنے حقیقی رنگوں کے ساتھ آپ پر صرف اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایک عرصے کے بعد صبح کے اسی منظر کو اپنی یاد کے نیلگوں آسمان پر جھلملاتا محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ کسی حادثے میں مبتلا ہوتے ہیں تو آپ کے محسوسات میں جوار بھاٹا آجاتا ہے، مگر اس حادثے کی ''حکمت'' اس وقت کھلتی ہے جب مدتِ مدید کے بعد نقشِ ماضی کی صورت میں آپ یاد کے روزن سے اس کا نظارہ کرتے ہیں۔ کمرہ اسی نوعیت کا فاصلہ عطا کرتا ہے۔ کمرے میں اس کے دوست کی حیثیت سے بیٹھ کر آپ اپنے سارے دن کے معمولات پر ذرا فاصلے سے نظر ڈال کر ان میں چھپی مضحکہ خیزی دریافت کرسکتے ہیں جو آپ کے سُوجے ہوئے چہرے پر ہنسی کی منور لکیریں پیدا کرسکتی ہے!

☆☆☆

معنی

زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی۔ خیال کا جسم بھی جلنے لگا تھا۔ تصور کا طائرِ آوارہ منقار زیرِ پر تھا۔ مجھے کالج سے گھر پہنچنا جلتے ہوئے صحرا کو عبور کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ زمین آگ اور آسمان آتش فشاں تھا، مگر آدمی کو بعض سفر ماحول کی ناموافقت اور وسائل کی کمی کے باوجود شروع کرنے اور جاری رکھنے پڑتے ہیں۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ آدمی کی اِسی مجبوری سے انسان کا ارتقا ہوا ہے، مگر مجھے اس وقت فلسفۂ ارتقا کی گتھی کو سلجھانے کی فکر تھی نہ سمائی، میں بس یہ چاہتا تھا کہ جلدی سے اور آرام سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں۔ انسان ایک لمحے میں جو اور جتنا چاہتا ہے اس کے فکر و احساس اگر اسی پر مُرتکز اور قانع رہیں تو زندگی سکھ سے گزرتی ہے یا کم از کم کسی نئے دکھ کے وار سے زندگی محفوظ رہتی ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ ایک لمحے کی خواہش کی تہ میں اور نہ جانے کتنی حسرتیں دَم سادھے پڑی ہوتی ہیں جو کبھی تو اسی لمحے کا دھڑن تختہ کر کے اپنے وجود کا اعلان کرتی ہیں اور کبھی آنے والے لمحوں کی سیج پر انگڑائی لے کر بیدار ہوتی دِکھتی ہیں۔ عجب تماشا ہے! میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں اگلے ہی لمحوں میں عجلت اور اطمینان سے گھر پہنچنے کی خواہش کے دام سے آزاد ہو چکا تھا۔ خیال کے جسم سے گرمی کی شدت کا خوف زائل ہو چکا تھا اور تصور کے آوارہ پرندے نے اپنے پر کھول دیے تھے۔

میں سوچنے لگا کہ کل بھی موسم اتنا ہی بے رحم اور سفاک تھا، مگر میں اس سے بے نیاز تھا، کیوں؟ کل مجھے سارا دن اپنی علیل بیوی کی خاطر بیسیوں مرتبہ ہسپتال کے وارڈ کے ڈاکٹروں

کے کمروں اور میڈیکل سٹور تک آنا جانا پڑا تھا۔ میں گھڑی بھر کے لیے یہ محسوس نہ کر سکا تھا کہ مجھے پورا دن دوائیوں کی بساند میں رہنا اور بازار تک دھوپ میں چلنا پڑا ہے۔ آدمی میں وہ قوت کہاں سے اور کیسے آتی ہے، جسے عصائے موسوی بنا کر وہ ماحول کی سختی اور حالات کی بے رحمی پر غالب آجاتا ہے۔ آج گرمی میں سفر کرتے ہوئے میں اِسی سوال کی لذت میں کھویا ہوا تھا اور اب بڑی حد تک ایک بار پھر فضا کی ناہمواری کے اثر سے محفوظ ہو گیا تھا۔ زندگی سے متعلق گہرے سوالات اکثر آدمی کو دُنیا کی بڑی سے بڑی ترغیبات اور عظیم مصائب تک سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ مجھیں تو قدرت کی یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ میں پہلا شخص نہیں ہوں جو اس سوال کی زد میں آیا ہو۔ غالباً ہر شخص عمر کے کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور ایسا سوچتا ہے کہ اسی میں اس کا انسان ہونا مضمر ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ دوسروں نے اس کا کیا جواب سوچا یا دیا ہے۔ دوسروں کے جوابات میرے لیے محترم ضرور ہیں مگر میرے لیے اہم جواب وہی ہے جو ایک روشن لمحے میں مجھے عطا ہوا ہے۔ ماحول کی سختی پر غالب آنے یا بے نیاز ہونے کا لمحہ وہ ہے جب آدمی اپنی زندگی کو پوری شدت سے بامعنی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے خیال کی ہر سرسراہٹ، احساس کی ہر لہر اور اس کی سانس کے ہر زیر و بم میں معنی کی غنائیت اور شعریت شامل ہو جاتی ہے۔

کل مجھے جب اپنی بیوی کی تیمارداری میں بے طرح مصروف رہنا پڑا تو ایک دم میری زندگی کا کشکول معنی کے دُرہائے نایاب سے بھر گیا تھا۔ میرے سامنے ایک عظیم مقصد تھا، جس کی خاطر مجھے اپنی سب توانائیاں اور وسائل بروئے کار لانے پڑ گئے تھے، اور اس عمل میں ایک عجیب سرفروشانہ شان اور مسرت تھی جس کے شیریں ذائقے کی یاد میں زندگی کی سختیوں کو گوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ زندگی میں معنی پیدا ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ آدمی اس غفلت یا کوتاہی کو ترک کر دیتا ہے جس کا وہ اکثر شکار رہتا ہے۔ دوسری علامت یہ ہے کہ آدمی کے اندر کی بہت ساری خفیہ صلاحیتیں اور امکانات آدمی پر روشن ہی نہیں ہوتے، وہ انھیں کام میں بھی لاتا ہے۔ پہلے زندگی مرغی کے ڈربے کی طرح ہوتی ہے، محدود تنگ اور متعفن اگر معنی کی نمود سے زندگی شاہین کی مانند ہو جاتی ہے۔ بلند پرواز اور ہر نوع کے نشیب و فراز کے خوف سے یکسر آزاد!

آدمی کا ایک المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے معنی تک پہنچنے کے لیے بالعموم کسی بحران، حادثے یا سانحے کا محتاج رہتا ہے، مگر کیا یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ صرف بحران ہی آدمی کو بے

معنویت اور اذیت کے عذاب سے بچائے؟ غالباً ایسا نہیں ہے۔ آدمی نے کاہلی کو اپنی عادت یعنی فطرتِ ثانیہ بنا رکھا ہے، اس لیے وہ ایک مسلسل غنودگی میں مبتلا ہے۔ چناں چہ جب تک کوئی حادثہ پیش نہیں آتا، اس کی نیند نہیں ٹوٹتی۔ یہ تو فطرت کی بندہ نوازی ہے کہ اسے جگانے کے لیے وہ حادثوں کا اہتمام کرتی ہے، اور انسان کو اپنی اصل سے ہم رشتہ ہونے کے قابل بناتی ہے۔ مجھے یہ خیال بار بار آیا ہے کہ آدمی کو اگر اپنی حقیقی آزادی واقعی عزیز ہے تو اسے جاگنے کے لیے حادثوں کا دست نگر ہونے سے آزاد ہونا چاہیے۔

کیسی عجیب بات ہے! ایک طرف آدمی عظمت، رفعت اور کشادگی کا والا و شیدا ہے اور دوسری طرف وہ مسلسل خود کو محتاج رکھتا ہے۔ آدمی میں بیک وقت شادہ اور گدا موجود ہیں۔ چاہنے کے عمل میں وہ بادشاہ ہے مگر پانے کے سلسلے میں اس کا طرزِ عمل گداؤں جیسا ہے۔ آدمی جو چاہتا ہے اسے مکمل صورت میں اپنی جھولی میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زندگی کا معنی بنی بنائی صورت میں اسے کسی ایک کتاب، کسی ایک ہادی، مرشد یا مصلح سے مل جائے، اور وہ تلاش کے خارزاروں میں بھٹکنے اور زخمی ہونے سے بچ جائے۔ کیا یہ مذاق نہیں کہ وہ اتنی اعلیٰ چیز کو اتنی آسانی سے حاصل کرنا چاہتا ہے؟ شاید اس نے معنی کے حصول کو دولت کے حصول کے مترادف سمجھ رکھا ہے۔ جس طرح دولت جمع کرنے کے لیے وہ اکثر شارٹ کٹ اختیار کرتا ہے، اسی طرح معنی سے معانقہ کرنے کے لیے بھی سادہ اور آسان راستے کی تلاش میں رہتا ہے۔ انسان کی تن آسانی اسے ہیرو پرستی اور بت پرستی پر مائل کرتی ہے، اور اسے یہ غور کرنے کی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنا ہیرو خود ہے۔

معنی ڈھلی ڈھلائی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا، معنی تو ایک زندہ باقاعدہ سانس لیتا ہوا تجربہ ہے۔ اس کے سانسوں کی میٹھی حرارت سے زندگی میں انوکھی گرم جوشی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ مختلف مفکرین اور مصلحین نے زندگی کے جو معنی بتائے ہیں وہ زندگی کے حتمی معنی نہیں ہیں۔ صرف ان کے باطنی تجربے میں جو یقیناً ان کے لیے بامعنی ہیں مگر ایک طرف ہماری ہیرو پرستی اور دوسری طرف ان کی انا نے انھیں حتمی اور سب انسانوں اور سب زمانوں کے لیے مطلق قرار دیا ہے۔ آدمی کی بڑی خواہش ہے کہ وہ انسانوں اور زمانوں دونوں پر حکمرانی کرے، اس لیے وہ اپنے تجربے کو "مطلق حقیقت" کے طور پر پیش کرتا ہے اور یوں دوسروں کے

راستوں میں کوہِ گراں نصب کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اور ہم جو راستے کے چھوٹے سے کنکر یا کانٹے کا زخم برداشت نہیں کر پاتے، غصے اور درد میں ساری دنیا کو برا بھلا کہنے لگ جاتے ہیں، کوہِ گراں سے ٹکرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چناں چہ اس کے قدموں میں جھکنے کو عین سعادت خیال کرنے لگتے ہیں، مگر کیا یہ اظہار، عاجزی کا ہے یا عجز ہمت کا؟

معنی اگر ڈھلی ڈھلائی صورت میں، خاص لفظوں میں مقید ہو سکتا تو تخلیق کاروں کو کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی کہ وہ لفظوں کے استعمال کے نئے قرینے تلاش کریں۔ نئی طرز ادا کی خواہش محض منفرد نظر آنے کی آرزو کا شاخسانہ نہیں، ایک حقیقی فنکار کی ذات میں اگر معنی کی جوئے رواں نہ ہو تو اس پر مُردنی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ معنی اسے زندہ اور تر و تازہ رکھتا ہے، اس لیے وہ تر و تازہ اسلوب بھی اختیار کرتا ہے، اگر چہ وہ دوسروں کے لیے باسی ثابت ہوتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ معنی محبوب کے حسن یا وصلِ یار کے گریز پا لمحے کی طرح بیان کی قید میں آ ہی نہیں سکتا، بلکہ یہ ہر وضع کی قید سے ماورا ہے۔ دوسرے لفظوں میں معنی کے ہاتھ آ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اب سارے گنجل کھل گئے اور آدمی سدا کے لیے اندر اور باہر سے آزاد ہو گیا۔ جلوۂ معنی کا نظارہ کامل آزادی نہیں، آزادی کی نوید ہے۔ یہ ایک ایسی چمک ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی گھنی ظلمت کے خوف سے آدمی کا پیچھا چھڑاتی ہے، اور ایک دودھیا راستے کی موجودگی کا یقین ابھارتی ہے، مگر آدمی اپنی کاہلی کے سبب اکثر اس مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس چمک نے ظلمتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھگا دیا ہے، چناں چہ وہ اگلے ہی لمحے پھر شر کی گرفت میں ہوتا ہے، یا کسی ''کوہِ گراں'' کے چرنوں میں گڑ گڑا رہا ہوتا ہے۔

☆☆☆

بیماری

بیماری کو دشمنِ جاں، جان کراس سے بھاگنا ایک مریضانہ رویہ ہے!
لوگ غالباً بیماری کو اس لیے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور اسے اپنی قلمروئے بدن سے دیس نکالا دینے کی سو سو طرح کی تراکیب اور مساعی سے کام لیتے ہیں کہ بیماری کے قدموں میں موت کی چاپ ہوتی ہے، اور لوگ زندگی سے اتنی اندھا دھند محبت کرتے ہیں کہ موت کی ذرا سی سرسراہٹ ہی ان پر لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ وہ بیماری کے خلاف اپنی دسترس میں جملہ توپ و تفنگ سے لے کر تعویذ گنڈے اور منتر جنتر کی قوتوں کے ساتھ صف آرا ہو کر، اصل میں موت کو مات دینا چاہتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ موت اس سارے عمل کو ایک خندۂ استہزا کے ساتھ دیکھ رہی ہوتی ہے۔ مگر ذرا غور کیا جائے تو بیماری ایک ایسا تجربہ ہے جو زندگی کی بہت سی بدصورتیوں کا قلع قمع کرتا ہے۔
زندگی اگر بیماری سے پاک اور موت کے خوف سے یکسر آزاد ہو جائے تو تمام شیطانی قوتیں زندگی کے مقدس معبد میں جمع ہو جائیں اور ان قوتوں کی مجلس شوریٰ انسانیت کے خلاف تدبیریں کرنے لگے۔ یہ بیماری کے وسیلے سے موت کا ڈر ہی ہے جو انسانوں کے اندر نرمی، دردمندی، بے غرضی اور شائستگی پیدا کرتا ہے۔ آدمی جب بسترِ علالت پر نیم جان حالت میں سوچتا ہے کہ یہ چراغِ حیات کسی وقت بھی گل ہو سکتا ہے تو وہ دوسروں کی امیدوں اور زندگی کے چراغوں کو گل نہ کرنے کی مجنونانہ حرکتوں سے باز رہنے کا ضرور فیصلہ کرتا ہے۔ یوں بیماری زندگی کی بے سمت و بے مہار قوتوں کو نکیل ڈال کر سہج سہج اور احساسِ سمت کے ساتھ چلنے کے قابل بناتی ہے

۔بیاری لو بھ، موہ اور کرودھ کے گلینڈز کے لئے تیر بہدف نسخہ ہے۔

بیماری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انسانی جسم کو تختۂ مشق بناتی ہے تو انسان اس سے بھاگنے کی کوشش میں اپنے اندر تک جا پہنچتا ہے۔ایک ہٹا کٹا انسان تو ہمہ وقت باہر کے ماحول پر حکمران بننے کی مشق کرتا رہتا ہے۔یوں باہر سے اس کا رشتہ دوستانہ نہیں معاندانہ ہوتا ہے۔اسے اپنی طاقت، ہیبت اور عظمت کا خود ساختہ گھمنڈ ہوتا ہے۔وہ نہ صرف اپنے راستے میں آنے والوں کے سَر برابر کرتا چلا جاتا ہے بلکہ اپنی ہمسری کے خواب دیکھنے والوں کو بھی راستے سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔شاید اسے ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کے ارد گرد کا سب کچھ اسے مٹانے کے درپے ہے۔چناں چہ وہ اپنے فرضی دشمن کو مورچہ بند ہونے سے قبل ٹھکانے لگانا فرض سمجھتا ہے،اور جب یہی انسان بیماری کی زد میں آتا ہے تو گویا باہر کی طاقتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اندر کی دنیا میں پہلی بار قدم رکھتا ہے۔اسے اپنے ہی گھر کا آنگن سُونا اور کاٹھ کباڑ سے اَٹا لگتا ہے،مگر اسے ایک تسلی سے ضرور ہوتی ہے کہ وہ اب کسی اجنبی جگہ پر نہیں،اپنے ہی عافیت کدے میں پہنچ گیا ہے۔

اس عافیت کدے میں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں اس کا سارا کچا چٹھا موجود ہے۔اس کے عُمر گزشتہ کے وہ کردہ ناکردہ اعمال کسی کھنڈر شہر کے آثار کی طرح یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں۔یوں وہ پہلی بار تجزیۂ ذات کے عمل سے گزرتا ہے۔بعض اعمال پر پشیمان ہوتا ہے اور بعض اسے تسکین دیتے ہیں،اسے بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا کوئی عمل پانی کے بلبلے کی طرح دو پل کی زندگی نہیں رکھتا، بلکہ انسانی عمل تو پودے کے مثل ہے: آہستہ آہستہ بڑھتا ،شاخیں نکالتا، پھل پھول یا کانٹے اگاتا ہے۔بیماری کے عالم میں وہ زندگی کے بہترین فیصلے کرتا ہے۔مشہور ناول نویس سیموئیل بیکٹ کو جب معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی بیماری کی زد میں آ گیا ہے جو کسی بھی وقت موت پر منتج ہوسکتی ہے تو اس نے اپنے تین بہترین ناول لکھے۔وہ موت کے احساس سے ہراساں ضرور تھا۔اس لیے کہ اس نے کوئی اہم کام نہ کیا تھا۔وہ زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کی آرزو رکھتا تھا۔اگر بیمار نہ ہوتا تو ہماری تمہاری طرح وہ ہر رات سونے سے پہلے کل یہی بڑا کام کرنے کا عہد کر کے خود کو رام کرتے کرتے عمر گزار دیتا۔کچھ لوگ بیماری کے خلاف کُل وقتی محاذ کھول لیتے ہیں اور ہاٹ لائن پر ہمہ وقت ڈاکٹروں،حکیموں یا پیروں،فقیروں سے رابطہ رکھتے ہیں۔بعض کو تو ہر بیماری کی کچھ نہ کچھ علامات اپنے اندر محسوس ہوتی ہیں مگر بیکٹ

جیسے لوگ اپنے اندر کی شکتی کو بروئے کار لاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ بیکٹ نے ڈاکٹروں کی پیش گوئی کے برعکس ایک لمبی عمر پائی۔ جھوٹ ڈاکٹروں نے بھی نہیں بولا ہوگا مگر بیکٹ نے جب اپنی خواہشِ بقا کو خالص تخلیقی سطح پر محسوس کیا تو وہ نہ صرف جسمانی موت کو سالوں تک دھکیلنے میں کامیاب ہوگیا بلکہ لفظوں میں بھی امر ہوگیا۔ یوں دیکھئے تو بیماری لازماً موت کی سفیر بن کر نہیں بلکہ بسا اوقات تو فنا پر غالب آنے کی قوت عطا کرتی ہے۔

بیماری پہلے پہل کلاسیکی غزل کے رقیب کی طرح لگتی ہے، جس کے خوف سے (زندگی کے) عاشق کی نیندیں حرام رہتی ہیں۔ آدمی دوا، تعویذ اور دعا...... سب محاذوں پر اس کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔ صحت مندی کی حالت میں تو آدمی روپے پیسے پر کنڈلی مار کے بیٹھتا ہے اور خدا کو کوئی دور پار کا رشتہ دار جان کر شادی غم کے موقع پر یاد کر لیتا ہے مگر بیماری اسے باور کراتی ہے کہ بھائی روپیہ پیسہ تو حقیری شے ہے، اسے خزانہ سمجھنے سے آدمی کو سانپ بننا پڑتا ہے۔ کیسی دلچسپ بات ہے کہ علالت میں وہ شخص اپنی ساری جمع پونجی ڈاکٹروں کی جیب میں یا منگتوں کے کشکول میں دان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے جو عام حالات میں کسی دوست کا ہوٹل کا بل یا ویگن کا کرایہ ادا کرنے میں تامل کرتا ہے۔ بیماری تسلیم ورضا کی الوہی خو پیدا کرتی ہے۔

البیر کامیو کے ناول "طاعون" میں جب اوراں شہر پر طاعون کا حملہ ہوتا ہے تو پہلی بار وہاں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ کر خالص انسانی سطح پر سوچتے ہیں ورنہ پہلے تو وہ اپنے معمولی شخصی مفادات کے گڑ سے چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ چناں چہ ان کی باطل سرگرمیاں، معاشرے میں کس قدر تعفن پھیلاتی ہیں، مگر بیماری کی زد پر آ کر وہ روحانی اور جذباتی رشتوں کی سچائی پر ایمان لے آتے ہیں۔ غالباً اسی لیے اللہ میاں بنی اسرائیل کی قوم پر وقتاً فوقتاً عذاب نازل کرتا رہتا تھا کہ ان کی ذات کا انسانی اور روحانی آئینہ مصفا رہے! قدیم بادشاہوں کو اس وقت اللہ نہ کا خیال آتا تھا جب ضعفِ علالت کے باعث وہ تخت پر سیدھے نہ بیٹھ سکتے تھے اور حکم صادر کرتے ہوئے ان کی زبان پہلی بار ان کے ضعیف دل کا ساتھ دیتی تھی، تبھی وہ اپنے جانشین کا تقرر کرتے تھے اور اسے پہلی یہی نصیحت کرتے تھے کہ بیٹا زندگی اور تخت شاہی آنی جانی شے ہے، مخلوق کی بہتری اور مظلوم کی دادرسی میں ہی نجات ہے۔ ضعف اور بیماری آدمی کو حق کے کتنا قریب کر دیتے ہیں!

☆☆☆

شام

شام اس قدر ہولے ہولے سے اُفق پر قدم رکھتی ہے جیسے دُلھن پہلی بار سسرال کی دہلیز پر قدم رنجہ فرماتی ہے، لجاتی ہوئی! مگر جس طرح دلھن کی موجودگی سے ایک دم سارا گھر اپنی جملہ مصروفیات ملتوی کر کے دُلھن کا خیر مقدم کرنے اور اسے ایک نظر جی بھر کے دیکھ لینے کو اُمڈ پڑتا ہے، مگر دلہن سب سے بے نیاز اور شانت ہوتی ہے، کچھ ایسا ہی حال شام کا بھی ہے۔ کائنات کی مشاطہ روزا سے اس خیال سے افق پر پرسجا کر بھیجتی ہے کہ زمینی مخلوق کی دم توڑتی خواہشیں نئے برگ و بار لا سکیں۔ آدمی بے اختیار ہو کر اس کی جانب بڑھیں، لیلیٰ کے پردۂ محمل کو کھینچنے کی جسارت کریں۔ چوں کہ کائنات کی مشاطہ جانتی ہے کہ تھوڑے آدمیوں کا وجدان اس سطح کا ہوتا ہے کہ جہاں پردۂ محمل خود بخود اٹھ جاتا ہے، آدمی اس درجہ خود کفیل ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اس کے اندر سمٹ جاتی ہے، وہ باہر کے موسموں کے تغیر اور محرکات کا محتاج نہیں رہتا۔ ورنہ اکثر احباب تو اصحابِ کہف ہیں کہ جب اٹھتے ہیں تو زمان و مکاں کا نقشہ ہی بدل چکا ہوتا ہے اور ان کی نقدی کھوٹی ہو چکی ہوتی ہے۔ شام ہمیں جگاتی اور اپنی جانب بلاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شام کا یہ بلانا ضرور کوئی ماورائی اشارہ ہوتا ہے کہ شام کی طرف قدم بڑھائیں تو شام جُل دے جاتی ہے اور ہمارا سامنا ایک اُسرار سے ہوتا ہے۔ رات ایک اُسرار ہی تو ہے!

میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ شام اہلِ زمیں میں کوئی خاص الخاص پیغام دینے والا ہرکارہ ہے۔ دیکھیں تو یہ پیغام ایک پوسٹ کارڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے! کھلا اور بے نقاب! مگر غور کریں تو پیاز کے پرتوں کی طرف نقاب اندر نقاب ہے!

شام ایک مصحف بھی ہے۔اس کا پیغام سمجھ میں نہ آئے تب بھی اس کی زیارت ایک سعادت اور برکت سے کم نہیں۔شام کی بارگاہ میں پہنچتے ہی دن بھر کے اضطراب کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔وہ ہماہمی جوانسانوں کواپنی معمولی آرزوؤں کے لیے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہوتی ہے،شام کے رُخِ زیبا کی زیارت کرتے ہی دم توڑ دیتی ہے اور آدمی کے اندر ایک تقدس کھل اٹھتا اور ایک پاکیزگی بیدار ہو جاتی ہے۔آدمی خود کو ایک نقطے پر مرتکز کر لیتا ہے۔ہر شخص کی زندگی کا ایک بنیادی محور ہوتا ہے مگر دنیاداری کے ہنگامے اسے،اس محور سے جدا رکھتے ہیں۔ اس جدائی کا خواہ اسے شعوری احساس نہ ہو مگر اس کی مسلسل بے آرامی،خوابوں کے انتشار اور معمولات میں اکتاہٹ کی تہ میں دراصل یہی مرکز سے جدائی سَر پٹخ رہی ہوتی ہے۔آدمی کو اپنے اس ''مرکز'' کا شعور یا تو روزانہ کے مشاغل سے مخلصی پا کر کسی دور دراز مقام پر ٹھکانہ کرنے کے دوران میں ہوتا ہے،یا بیماری کے عالم میں ہوتا ہے یا پھر شام کو......اگر اس کے پاس شام کو ایک نظر دیکھنے کی فرصت اور نظر ہو!شام اپنی خاموشی کی زبان میں اسے باور کراتی ہے کہ میاں تیری یہ بھاگ دَوڑ کس قدر لاحاصل ہے!تو دِن رات ایک ایسی چیز کے تعاقب میں ہے جو تیرے ہر قدم کی آہٹ پر تجھ سے مزید دور ہو جاتی ہے۔اور یہ دوری،روایتی عشق کا ہجر نہیں جو شوق کو فراواں کرتا ہے بلکہ یہ تو شوق کو بھی مار مارتی ہے اور پھر آدمی رفتہ رفتہ دنیا سے ہی بیزار ہونے لگتا ہے۔یہ جو ہمارے اردگرد گلہ گزار زبانوں کا شورِقیامت برپا ہے اس کا سبب یہی ہے!شام آدمی کو اپنی ذات کے مرکز سے تجدیدِ تعلق کی تحریک دیتی ہے۔

آدمی پر اس کی انا اس قدر حاوی ہے کہ وہ ''اپنے'' اور اپنے ''کمالات'' کے سوا ہر شے سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے۔اکثر تو وہ خدا بھی بننے لگتا ہے......خدا نے اسے پاؤں دیے مگر وہ پَر مانگتا ہے۔اسے ضرورت کے لیے دو چار گز زمین چاہیے،مگر وہ پورے کرۂ ارض پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا اور ستاروں تک کمندیں ڈالتا ہے۔خدا نے انسان کے دل بہلاوے کے لیے صبح و شام تخلیق کیے اور اس میں اپنی نشانیاں رکھیں مگر شاید حضرت انسان خدا کے اس فصل کو کسی ''شریک رشتہ دار'' کا احسان گردانتا ہے،اس لیے انسان نے اپنے لیے تفریح کے ہزار رنگ ایجاد کر لیے ہیں اور صبح و شام کو بھولتا جا رہا ہے،خاص طور پر شہر کا باسی۔اگر یہی حال رہا تو مستقبل کی نسلوں کے درسی نصاب میں شامل ہوگا کہ وہ ایک پیریڈ صبح و شام کی دید کے لیے مختص کریں۔

جوش نے کہا تھا کہ اگر پیغمبر نہ ہوتے تو ثبوتِ حق کے لیے صبح ہی کافی تھی اور میرا خیال ہے کہ اگر فلسفی اور صوفی اور شعرا نہ ہوتے تو عرفانِ ذات کے لیے شام کافی تھی۔ کیوں کہ شام تو سورج کا ڈوبنا ہے مگر یہ ایک "طلوع" بھی ہے، رات کا طلوع؟ اور رات جو انسان کے باطن کا خارجی پیکر ہے۔

مجھے شام اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس کی انسان کے ازلی دکھ سے گہری مناسبت ہے۔ شام باور کراتی ہے کہ جواں سال زندگی بھی آخر بے دَم ہو جاتی ہے، قافلے منزل پر نہیں بھی پہنچتے، امیدیں پوری نہیں بھی ہوتیں، مخلصانہ اور بھرپور کوششیں بھی ناکام ہو جاتی ہیں اور دل بھی ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ زندگی میں ایک ایسا حسن ضرور موجود ہے، جو کبھی کبھی بس ایک لمحے کے لیے دکھائی دیتا ہے، مگر زندگی کا سارا دَم خَم اِسی ایک لمحے کے دَم سے ہے!

ناتجربہ کاری

میرے ایک دوست کی رائے ہے کہ آدمی سے انسان بننے کا سفر ناتجربہ کاری کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے تجربہ کاری کی پختہ، کشادہ شاہراہ تک کا سفر ہے۔ ان کا تھیسس ہے کہ آدمی ٹھوکر کھاتا اور ہاتھ پاؤں تڑواتا ہے، اور پھر چند گراوٹوں کے تلخ ذائقوں سے تجربہ کاری کا رسیلا اَمرت کشید کر لیتا ہے، جسے وہ اپنے دماغ کے کسی محفوظ کونے میں کمال احتیاط سے رکھ دیتا ہے۔ پھر جوں ہی کوئی مشکل گھڑی آتی ہے، وہ اس اَمرت کا ایک گھونٹ چڑھاتا، اپنے اشہب دانش کو ایڑ لگاتا اور کامیابی منزل کو سَر کر لیتا ہے اور یہی اَمر اس کے آدمی سے انسان بننے کا ثبوت ہے۔

مگر مجھے اپنے دوست کی ان حکیمانہ باتوں سے اختلاف کی کافی گنجائش نظر آتی ہے۔ تجربہ کار شخص تو سیکھنے اور جاننے کے معصومانہ عمل کی نفی کر کے بس ایک یا چند اسباق کا اثبات کرتا ہے۔ وہ زندگی کو چابی کا کھلونا سمجھتا ہے، اپنی فہم کے چند سکے ادا کر کے ایک کلید خرید لیتا ہے جس کی مدد سے وہ کھلونے کے کھیل کا تماشا کرتا ہے۔ حالاں کہ ہستی کی زیرکِ نگاہوں میں وہ خود ایک تماشا ہے۔ زندگی ترشی ترشائی شاہراہ نہیں، یہ تو ایک جنگل ہے جہاں کوئی راستہ نہیں، کسی کے قدموں کے نشان سلامت نہیں۔ راہنمائی کے لیے کوئی منارۂ نور نہیں۔ البتہ ہر قدم پر ایک چاپ ضرور سنائی دیتی ہے، مگر یہ چاپ کسی خونخوار جانور کے وحشت آثار قدموں کی چاپ نہیں؛ یہ تو انسان کے اندر کی چاپ ہے جو اسے آگے بڑھنے اور اپنے قدموں سے راستے وضع کرنے کی

ترغیب دیتی ہے۔ جوں ہی وہ اپنی راہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ چاپ آگے بڑھ کر لحظہ بھر کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔

ناتجربہ کار آدمی زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے۔ وہ زندگی کے سب رنگوں اور موسموں کی راہ ایک تخلیق کار کے سے اضطراب اور ایک معشوق کی سی سپردگی کے جذبے کے ساتھ تکتا ہے۔ اس کے لیے ہر طلوع ہونے والا منظر آنکھوں میں بسا لینے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں زندگی کے بدلتے مناظر اور اوپر تلے وقوع ہوتے واقعات پہیے کا چکر نہیں بلکہ پھلجھڑی کی طرح ہیں جو لمحہ بھر کے لیے ماحول میں نور، رنگ، حرارت اور چہکار پیدا کرتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ جب کہ تجربہ کار آدمی ہمیشہ ایک دائرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ وہ ایک رٹے ہوئے سبق سے ہر بات کو سمجھتا ہے بلکہ اس نے اپنے ذاتی تجربے سے معانی کا قاعدہ ترتیب دیا ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہر نئی بات اسی قاعدے میں پہلے سے درج ہے۔ اس کے معانی کی فرہنگ میں کبھی کوئی لفظ متروک ہوتا ہے، نہ نیا داخل ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے معانی کے قاعدے یا فرہنگ کے کسی تازہ ایڈیشن کی ضرورت سے بھی بے نیاز ہوتا ہے۔

تجربہ کار زندگی کو ایک دیگ خیال کرتا ہے، جس کا فقط ایک چاول چکھ کر وہ پوری دیگ کے ذائقے کو جانچ لیتا ہے۔ ادھر ناتجربہ کاری انسان کو زندگی کے خوانِ یغما پر بچی قسم قسم کی ڈشوں کے نو بہ نو ذائقوں سے متعارف ہونے کے قابل بناتی ہے۔ تجربہ کار پتنگا اور ناتجربہ کار بھونرا ہے۔ پہلے کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ایک مرکز میں خود کو مرکوز اور بعد ازاں معدوم کر لیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ تھڑ دلا ہے۔ جستجو و تلاش کی لافانی کسک سہارنے کی تاب نہیں رکھتا، جب کہ بھونرا ایک تجربے کی لذت اور اس لذت سے سیری کی اذیت کے بعد کسی تازہ لذت اور اس سے وابستہ اذیت اٹھانے کی طاقت سے ہمکنار ہے۔ تجربہ کار زندگی کو رفیقۂ حیات کے روپ میں اور ناتجربہ کار محبوبہ کی صورت میں دیکھتا ہے۔ سو اول الذکر کے ہاں خواہش اور امید کی پیدا کردہ رنگارنگی کے بجائے ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہے، مگر آخر الذکر ہمہ دم خواہش اور اس کے پورا ہونے کے انتظار میں سلگتا رہتا ہے۔ ایک کو زندگی بوسیدہ، پرانی اور زود یکھے جانے کے قابل محسوس ہوتی ہے، دوسرا نئے پن کی مسرتوں سے سرشار رہتا ہے۔

ناتجربہ کار اس مختصر، ناقابلِ اعتبار اور فنا پذیر زندگی کو سو رنگ میں جی لیتا ہے۔ جب کہ

تجربہ کار ایک رنگ پر قناعت کر کے عمر بھر تنگیِ داماں کا گلہ گزار رہتا ہے۔ دراصل ثانی الذکر عمرِ رواں کے ایک پل پر گلِ محمد کی طرح جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی میں صرف ایک بار جینے کی لذت یا مرنے کی اندوہناکی کا سامنا کرتا ہے مگر نا تجربہ کار جینے میں مرنے اور مرنے میں جینے کے رنگ برنگ تجربات سے گزرتا ہے۔ ایک، معصومیت کو عہدِ طفلی کی نادان یاد سمجھ کر لوحِ دماغ سے کھرچ ڈالتا ہے، دوسرا معصومیت کی ملائم کیفیت میں سدا بھیگا رہتا ہے، چناں چہ تجربہ کار کسی کچے پکے نظریے پر کاربند رہنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس سے بال برابر انحراف کو ناپسند کرتا ہے۔ دنیا میں کتنی ہی خوفناک جنگیں ''تجربہ کاروں'' کی ادائیگیِ فرض کے نتیجے میں لڑی گئی ہیں یا نظریہ پسندوں کے بے لچک رویے کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں!

بچوں، عورتوں اور آرٹسٹوں میں نا تجربہ کاری لہو کی مانند رواں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خوبصورت اور بدصورت، پُرمسرت اور پُراذیت ہر طرح کے سیکڑوں تجربات کے لیے چشم براہ رہتے ہیں، ایسے لوگ فی الحقیقت درخت کی طرح ہوتے ہیں، جو دھوپ، بارش، آندھی، موسم کے سرد و گرم اور زمین کے سب ذائقوں کو اپنے وجود میں جذب کرتا اور یوں نشوونما پاتا ہے۔ انھی لوگوں کا دَم ہے کہ یکسانیت سے معاشرے کا دم نہیں گھٹتا۔ اصل میں ان کی نظر میں کوئی ایک چیز اتنی قیمتی اور حتمی نہیں ہوتی کہ اس کے سوا باقی ہر شے کا منہ چڑایا جائے۔ ادھر سیاسی اور کاروباری آدمی پکے تجربہ کار ہوتے ہیں۔ چیزوں اور لوگوں کو آزمودہ طریقوں سے اپنے مقاصد کی سان پر چڑھانا ان پر ختم ہے۔ نا تجربہ کار چیزوں کے حسن اور لوگوں کی مروت کا قائل ہے جب کہ تجربہ کار اشیا کی افادیت اور افراد کی مقصد براری سے غرض رکھتا ہے۔ ایک کا دل آسمان کی پہنائیوں کی طرح کشادہ، دوسرے کا دامن پہاڑی وادی کی طرح تنگ ہوتا ہے۔ ایک تنوع پسندی کی بنا پر آزاد ہے، دوسرا افادیت پسندی کی وجہ سے پابند!

تجربہ کاری اور نا تجربہ کاری فی الاصل انسانی معاشرے کے دو مستقل رجحان بھی ہیں، جو ایک دوسرے کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکتے ہیں، مگر نہ تو ایک دوسرے کو شکست فاش دے کر منظر سے معدوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور نہ ہی ایک تنہا اپنے وجود کا اعلان کر سکتا ہے۔ تجربہ کاری دل کی سخت گیری کی اور دماغ کی کٹر پسندی کا اعلامیہ ہے، جب کہ نا تجربہ کاری اسی سخت گیری کو رد کرنے سے عبارت ہے۔ تجربہ کار شخص کی نظر میں اس دنیا کا ایک متعین نظام ہے'

جس میں نا تجربہ کار خلل ڈالتا ہے۔ ہیر رانجھا کی لوک داستان میں کیدو تجربہ کاری کی علامت ہے، اور ہیر اور رانجھا سرتاپا نا تجربہ کار ہیں۔ کیدو کا سرد گرم چشیدہ تجربہ بتاتا ہے کہ عشق ایک آگ ہے جو خاندان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، اس لیے وہ آگ کو بجھانے کے لئے ڈٹ جاتا ہے۔ اگر چہ اس کھیل میں کیدو جیت جاتا ہے مگر نا تجربہ کار ہیر اور رانجھا ہارنے کے باوجود امر ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ فتح دراصل نا تجربہ کاری کی فتح ہے۔

☆☆☆

تنہائی

کمرے کی بے شکل تنہائی جب اپنی موجودگی کے احساس سے مجھے ادھیڑنے لگتی ہے تو میں تنہائی کو کمرے میں قید کر کے باہر آ جاتا ہوں۔ تالا لگاتے ہوئے ایک فاتحانہ مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل جاتی ہے کہ اب تنہائی، اکلاپے کی دہشت سے گُھٹ گُھٹ کر مر جائے گی اور جب میں دوبارہ کمرے میں آؤں گا تو اس کی لاش بھی رزقِ ہَوا ہو چکی ہوگی۔

مَیں سڑک پر ٹہلنے لگتا ہوں۔ گرما کی چھٹیوں کے سبب کالج کیمپس کی سڑکوں پر کوئی اِکا دُکا آدمی ہوتا ہے۔ سڑک پر چکر لگاتے ہوئے، مَیں سامنے پہاڑ کی چوٹی پر نظر ڈالتا ہوں، وہاں مٹیالے بادلوں کا ایک کارواں درختوں کو سَر سے پاؤں تک چومتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ معاً میرے اندر ایک خواہش جاگ پڑتی ہے کہ کاش اس سمے میں پہاڑ کی چوٹی پر ہوتا، بادل میرے جسم کو چھوتے، گدگدی کرتے......اور میں ان شریر ہستیوں کو اپنی مٹھی میں قید کر لیتا......مگر اسی لمحے مجھے ایک ساتھی استاد نظر آ جاتا ہے اَور میں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کولتار کی سنگلاخ سڑک پر آ گرتا ہوں۔

اپنے ساتھی استاد سے باتیں کرتے ہوئے مجھے لگتا ہے، مَیں پھر سے کمرے میں محبوس ہو گیا ہوں اور تنہائی اپنے لمبے ناخنوں سے مجھے نوچنے لگی ہے۔ کچھ لوگ ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح ہوتے ہیں کہ ان سے مل کر، سلسلۂ کلام جوڑ کر آپ کے اندر کچھ کھلنے لگتا ہے اور آپ کے مَن کے جنگل میں ایک مدہوش کر دینے والی خوشبو پھیل جاتی ہے، اِرد گِرد سب بدلا بدلا اور پیارا پیارا نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی میں ایک نیا اور وُسعت بداماں معنی پیدا ہو جاتا ہے، مگر بعض حضرات

میں آندھی کی صفت ہوتی ہے کہ اُن کی قربت میں خوف اجنبیت اور گریز کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اور آپ موقع پاتے ہی ان سے اجازت چاہے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ان صاحب کی ''مُصاحِبی'' سے جلد نجات پالیتا ہوں۔

بادل اب گزر چکے ہیں اور پہاڑ پر درخت آسودہ حالت میں کھڑے ہیں۔ میں کالج کیمپس کی سڑکوں پر آوارہ خرامی میں مصروف ہوں...... جو مسکراہٹ کمرے کو تالا لگاتے ہوئے میرے لبوں پر کھلی تھی، وہ کب کی راکھ ہو چکی ہے۔ میں اپنی قوتِ ارادی کے بل پر، سڑک کے دائیں بائیں درختوں اور اُن میں گنگناتے پرندوں کی انجمن میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر دفعتاً احساس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے کس درجہ اجنبی ہیں اور میں اُن کے لئے کتنا نامانوس ہوں۔ میرا اور شاید اِس زمانے کے اکثر اَفراد کا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے اِردگرد سے رشتے، شعور اور ارادے کی قوت سے جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ کسی زمانے میں انسان اپنے چو گرد فطرت اور انسانوں سے لاشعوری اور گہرے جذباتی تعلقات رکھتا تھا۔ وہ درخت سے پھل اور میٹھی چھاؤں کی لذت تو پاتا ہی تھی، درخت کو اپنے قبیلے کے ایک معزز فرد کا رُتبہ بھی دیتا تھا۔ چڑیوں کے چہچہوں میں اپنے بچوں کی مدھر آوازوں کا رَس محسوس کرتا تھا۔ محبوب کے پاس کبوتر کے ہاتھ چٹھی بھیج دیتا، اور کوے کے مُنڈیر پر بولنے سے جان جاتا کہ اس کے کسی پیارے نے کوے کی زبانی اپنے آنے کا سندیسا دیا ہے مگر بیسویں صدی کے آخری عشرے میں رشتوں کا ''کل'' اِتنے ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اِدھر اُدھر بکھر گیا ہے کہ انھیں پھر سے جوڑ کر کُل کو بحال کرنا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔

فی زمانہ انسانی تہذیب نے ''ہم'' سے ''میں'' کی جانب پیش قدمی کی ہے، اور افراد سے لے کر اشیا تک میں ''مَیں'' کے شور کو بھی شامل سمجھنا چاہیے، جس کی گونج ذہن کے نہاں خانوں میں لرزش پیدا کررہی ہے۔ بظاہر تو سٹیلائٹ نے پوری دُنیا کو ایک بستی میں بدل دیا ہے اور ہم کُرہ اَرض کے کسی کونے کھدرے میں ہونے والی تبدیلی سے فوراً باخبر ہو جاتے ہیں، دور دراز کے برّاعظموں اور جزیروں کی خبریں ہمیں اپنے محلے کی روزمرہ زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں مگر پھر بھی ہم کتنے تنہا او[illegible] ردگرد سے کتنے اجنبی ہیں!

مگر شاید اصل بات نہ اجنبیت ہے نہ تنہائی! ہم اپنے آپ سے اور گردوپیش سے کچھ زیادہ ہی باخبر ہو گئے ہیں۔ انفارمیشن کی رَسد ہماری طلب کی پابند نہیں رہی۔ میں جب اپنے کسی کولیگ سے

ملتا ہوں تو مجھے اس کے چہرے پر اُس کی ریا کار داخلی شخصیت کی ساری کہانی لکھی دکھائی دیتی ہے۔ بڑے ہو جانے میں ایک قباحت یہ ہے کہ شخصیت کے مستقل رویے چہرے کی لکیروں میں خیمے لگا لیتے ہیں اور نفسیات نے وہ عینک مہیا کر دی ہے کہ خیموں کے اندر تانک جھانک کر سکتے ہیں.....اور جب میں طلبہ کو پڑھا رہا ہوتا ہوں تو مجھے خوب علم ہوتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مَیں صرف وہ باتیں معصوم، متجسس ذہنوں میں اتار رہا ہوں جو نصاب میں درج ہیں، جو یا غلط ہیں یا پھر مصلحت پر مبنی ہیں۔ اور جب میں سڑکوں پر آوارہ پھرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کائنات کروڑوں کہکشاؤں پر مشتمل ہے اور یہ زمین ایک چھوٹی سی کہکشاں کا ایک نہایت حقیر سیارہ ہے، جس کے ایک براعظم کے ایک چھوٹے سے ملک کے چھوٹے سے شہر کے مضافاتی کالج کی ایک سنسان سڑک پر مَیں موجود ہوں۔ میری اوقات ہی کیا ہے! اور یہ باتیں سوچتے ہوئے مجھے اپنی حماقت کا علم ہوتا ہے۔ تنہائی کا تو کوئی خارجی وجود نہیں۔ تنہائی تو میرے اندر ہے! میرے تصورات اور خیالات میں لہریں لے رہی ہے۔

میں اِن لہروں پر بہتی تنہائی کو جہنم رسید کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مجھ سے اطمینان اور سکھ چھینتی ہے.....مگر میرے تصورات باڑھ کی فاضل شاخیں نہیں کہ انھیں کاٹ پھینکوں، اور تنہائی سے مکتی پالوں۔ یہ تصورات تو میرے چار سُو بکھری زندگی کے دھارے سے میری ہستی میں قطرہ قطرہ جذب ہو رہے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ کسی معمولی دُم دار ستارے کی طرح مَیں کسی بڑے سیارے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہوں اور اِس بسیط کائنات میں جا بجا میرے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں اور ہر ٹکڑا.....بکھرنے کے کرب انگیز شعور میں سلگ رہا ہے۔ اصل میں تنہائی آدمی کو جان سے نہیں مارتی، تنہائی میں شعور اتنا چکا چوند ہوتا ہے کہ اِردگرد کی سب چیزوں کا باطن جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا ہے اور ہر شے کا باطن رسیلا.....اور آنکھوں کے لیے بھلا نہیں ہوتا.....مگر آنکھوں پر ہاتھ بھی تو نہیں رکھا جا سکتا۔

سوچتا ہوں، اس صدی میں نشہ آور چیزوں کی مانگ اور کھپت میں بے تحاشہ اضافے کا سبب کہیں تنہائی اور شعور کی وہ چکا چوند تو نہیں، جس میں ہم لت پت ہیں۔ نشہ کی مدد سے آدمی اپنے گرد اندھیروں کی ایک گھنی فصیل اٹھا لیتا ہے، جس میں کوئی بیرونی کرن داخل نہیں ہو سکتی اور خود انسان بھی اندھیرے کی لذت چاٹتے چاٹتے ایک دن اندھیرے میں تحلیل ہو جاتا ہے.....اُدھر

تنہائی کی دہشت سے بچنے کے لیے انسان نے اپنی سماجی سرگرمیوں کی تعداد میں اضافہ اور اُن کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا کر لی ہے۔ وہ خُود سے بھاگنے کے لیے گُروہ کے نغموں، چیختے لفظوں اور بے خود متحرک تصویروں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یُوں اندر اِک بھری تنہائی سے، اس نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر یہ بھی تو ایک قسم کا نشہ ہی ہے۔ انسان کے ان اعمال سے تنہائی کسی چڑیل کی طرح بہادر ہوگئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز اولادِ آدم اِس تنہائی سے ہار کر یا تو کسی دوسرے سیارے کا رُخ کرے گی یا پھر اس سیارے کو بھی نیوکلیائی ہتھیاروں سے بھون ڈالے گی!

حد سے بڑھی ہوئی باخبری نے ہمیں تنہا کر دیا ہے۔ اس سے قبل ہم صدیوں بے خبری کی لذیذ نیند میں مَست رہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمیں کچی نیند سے جگا دیا گیا! اِس لیے ہمارا دل بوجھل، دماغ پریشان اور اعصاب تھکن سے چُور ہیں۔ اس ''بے وقت'' کی بیداری سے ہم آہنگ ہونے میں شاید کچھ مزید وقت درکار ہے۔

دوسری طرف ہم نے نئے خیالات اور تازہ معلومات سے اپنے دماغوں کو کھچا کھچ بھر تو لیا ہے لیکن انھیں جذب نہیں کر سکے۔ نئے خیالات کو جذب کرنے کے بعد ہی وہ فراست پیدا ہوتی ہے، جو اعلیٰ سطح کے سکھ اور اطمینان کو راہ دیتی ہے۔ جس طرح عورت کے اندر ماما دھیرج سے بیدار ہوتی اور آہستہ آہستہ اس کے بدن کی پور پور میں پھیل جاتی ہے اور پھر وہ سرتا پا ایک ناقابل بیان لذت میں کھو کر نئے وجود کو جنم دینے کے قابل ہو جاتی ہے کچھ اسی طرح انسانی ذہن ہے، جو نئے خیالات کے بیج کو دھیرج سے قبول کرتا، نئے بیج کی توانائی کو سہج سہج اپنے اندر پھیلاتا ہے۔ دماغ علم کی روشنی کے لیے اپنے دروازے سدا کھلے رکھتا ہے مگر روشنی کے اس سیلاب پر سراپا احتجاج بن جاتا ہے جو دروازوں کو بھی ساتھ بہا لے جائے!

تنہائی کا ایک اور روپ بھی ہے! جب اس میں مبتلا ہو کر انسان بکھرنے کے کرب کے بجائے مجتمع ہونے کی لذت سے سرشار ہوتا ہے، یہ تنہائی تخلیقی ہے۔ آدمی کو اندر سے اِتنا بھر دیتی ہے کہ باہر کے خالی پَن کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ میں نے ایک دوست کو اسی وضع کی تنہائی کے کرشموں سے فیض یاب پایا ہے۔ وہ زندگی یوں جیتا ہے جیسے کائنات میں اسے یا تو کسی شے کی ضرورت ہی نہیں رہی یا پھر پُوری کائنات اس کی مٹھی میں سمٹ آئی ہے۔

☆☆☆

آخری آدمی

پیچھے رَہ جانے والے ہی زندگی کے اصل لطف سے آشنا ہوتے ہیں! مجھے یہ عرفان سائیکل ریس میں پیچھے رَہ جانے والے ایک نوجوان سے ملا ہے۔

کالج کی سالانہ سپورٹس میں طلبا کی سائیکل ریس بھی شامل تھی۔ ریس میں کئی طلبا نے حصہ لیا۔ ابتدا میں ہر ایک نے پوری قوت اور مہارت سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ پہلے ہی چکر میں مختلف سائیکلسٹوں کے درمیان فرق اور فاصلہ پیدا ہونے لگا۔ جیسے جیسے چکر بڑھتے گئے، سائیکل سوار تین گروپوں میں بٹتے گئے۔ پہلے گروپ میں وہ نوجوان شامل تھے جو سب سے آگے تھے اور پسینہ پسینہ تھے۔ دوسرا گروپ ان طلبا پر مشتمل تھا جو اگلوں سے جا ملنے کی کوشش میں بے حال ہو رہے تھے، اور آخری گروپ میں دو تین ایسے نوجوان تھے جو سب سے پیچھے تھے اور جن کے ماتھے عرقِ ندامت سے بھیگ رہے تھے۔ تماشائیوں کی نگاہوں اور دادو بے داد کا مرکز پہلا گروہ تھا یا آخری۔ درمیانہ گروپ درمیانے طبقے کی طرح بے توجہی کا شکار تھا۔ مقررہ بارہ چکروں میں سے جب آٹھواں چکر مکمل ہوا تو پہلے تین نمبروں کے سائیکل سوار ہی دادو تحسین کا محور تھے۔ ایک نوجوان جو سب سے آخر میں تھا، اوّل اوّل اُس نے آگے جانے کی بہتیری کوشش کی، محنت اور ندامت کے پسینے میں شرابور ہو کر۔ پھر جب پہلے گروہ اور اس کے درمیان فاصلہ کئی چکروں کا ہو گیا تو اس کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی اور پھر ایک دَم اس کا دونوں قسم کا پسینہ بھی خشک ہو گیا۔ شاید اُس نے مقابلہ بازی کی مشقت سے خود کو آزاد کر لیا اور شانت ہو گیا۔ اب وہ مَن مرضی سے

سائیکل چلانے کا لطف لینے لگا۔

میرے دائیں بائیں اساتذہ اور طلباء اُٹھ اُٹھ کر پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والوں کے درمیانی فاصلوں کو لمحہ بہ لمحہ ماپنے لگے اور نعرے لگانے لگے۔ مقابلے میں شریک سواروں کی طرح تماشائیوں کے جذبات بھی شدت پکڑ چکے تھے، مگر میں اطمینان کے ساتھ اس آخری نوجوان کو دیکھنے میں محو تھا، جسے اب نہ مقابلے سے دلچسپی رہی تھی، نہ تماشائیوں کی داد کی طلب اور نہ استہزا کا ڈر باقی رہا تھا۔ وہ اب بارہ چکر مکمل کرنے کے جبر سے بھی نجات پا چکا تھا۔ وہ بس سائیکل چلانے کی مسرت میں کھویا ہوا تھا۔ بظاہر ریس میں اس کا آخری نمبر تھا اور شکستِ فاش اس کے حصے میں آئی تھی، مگر اس کی ''کارکردگی'' سے لگتا تھا کہ اس نے عارفانہ سلوک کی وہ منزل سَر کر لی ہے جہاں ریس اور مقابلہ بے معنی سرگرمی لگتے ہیں۔ آدمی دوسروں کے ساتھ مقابلہ کرنے اور پہلا نمبر حاصل کرنے کی ہوَس کو اپنی بہترین قوتوں کے زِیاں کے مترادف خیال کرتا ہے۔ پہلے نمبر کی معنویت کیا ہے؟ صرف یہی نا کہ کچھ لوگ تھوڑی دیر کے لیے تعریف سے نوازیں یا پھر وکٹری سٹینڈ پر کھڑے ہو کر مہمان خصوصی سے انعام لیا اور تصویر بنوا لی۔ مگر اس تگ و دو میں کس قدر اپنا پِتا مارنا اور دوسروں کا پتا کاٹنا پڑتا ہے، مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی ریس سے محظوظ ہونے کے بجائے لوگوں کو محظوظ کرنے لگتا ہے۔ آخری آدمی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو دوسروں کے ہاتھ میں نہیں دیتا جس کے بغیر ریس سے حظ اٹھانا ممکن ہی نہیں۔

ایک عاشق کی مانند ہی آخری آدمی دنیا کے سلسلے میں بے پروا مگر اپنے مقصود یعنی کھیل کی لذت کے لیے سخت متعصب ہوتا ہے۔ اکثر نمبروَن کی خواہش کا دوسرا نام حِرص اور اس کے لیے کوشش کا دوسرا نام عیاری ہے۔ اگر اُن کے سامنے سے وکٹری اسٹینڈ اور اِنعام ہٹا دیا جائے تو ان کے لیے ایک قدم اٹھانا مشکل ہو جائے۔ بغیر لالچ کے ان کے لہو میں جِدت اور بغیر ترغیب کے دوسروں سے آگے بڑھنے کی اُن میں ہمت پیدا نہیں ہوتی، مگر پیچھے رَہنے والے انعام اور لالچ کو پرِ کاہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ وہ اندر کی تحریک پر سفر پیما ہوتے ہیں۔ اُن کے لیے سفر میں مُبتلا رہنا بجائے خود ایک نعمتِ عظیم اور انعامِ بے مثال ہوتا ہے۔ چناں چہ ان کے لیے سفر کی صعوبت سفر کی لذت بن جاتی ہے۔

آخری آدمی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی رفتار دھیمی رکھتا ہے۔رفتار تیز ہو تو آدمی ہو یا مشین جلد خرچ ہو جانے کا اندیشہ ہے، مگر مدھم رفتار میں آدمی خود کو گویا اگر بتی کی طرح سلگائے رکھتا ہے۔ بگٹٹ بھاگنے والے صرف منزل کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور یوں خود سے، آس پاس سے ،جسمانی، ذہنی اور اخلاقی سطحوں پر بے خبر ہوتے ہیں۔ جب کہ آہستہ رَو لوگ نہ صرف چلنے کی مسرت کو قدم بہ قدم جُرعہ جُرعہ پیتے ہیں بلکہ اپنے آپ اور اردگرد سے وابستہ بھی رہتے ہیں۔ چناں چہ تیز رَو لوگ تنہا اور انجام کار یاسیت کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ آہستہ چلنے والے یار باش اور امید پرست ہوتے ہیں۔ مجھے ہر نا امید آدمی اوّل نمبر کی آرزو اور وِکٹری اسٹینڈ پر سدا ایستادہ رہنے کی خواہش کا مارا ہوا لگا ہے۔

پہلی پوزیشن پر مر مٹنے والا اوّل درجے کا مادہ پرست ہے۔اس کے لیے زندگی طلائی تمغے اور واہ واہ ہے، سراسر دوسروں کی عطا کی ہوئی! اس کے لیے زندگی کے معانی خود زندگی کے اندر سے پیدا نہیں ہوتے۔اس کی نظر میں زندگی کے بامعنی یا بے معنی ہونے کا انحصار اُوروں کے عطا کرنے یا محروم رکھنے پر ہے۔ وہ زندگی کو اپنے ہاتھوں میں بقول شاعر ایک لبا لب پیالے کے طور پر محسوس نہیں کرتا۔اگر وہ ایسا محسوس کرنے کی سعادت پالیتا تو پیالے کو بے وجہ چھلکنے سے بچانے کی ذمہ داری بھی قبول کرتا، تیز رَوی میں جس کے چھلک جانے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

زندگی کو اپنے ہاتھوں میں ایک لبالب پیالہ خیال کرنا اتنا زبردست تجربہ ہے کہ زندگی کے سب زیاں وضیاع کا قلق جاتا رہتا ہے۔ یہاں زندگی بطور زندگی اپنی قیمت اور معنویت کا احساس پیدا کرتی ہے، جینا بجائے خود ایک نایاب واردات بن جاتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کا جینا زندگی سے خالی ہے۔ وہ چیزوں پر مَرتے مَرتے زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔نرے روبوٹ بن جاتے ہیں۔ کہنے کو وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ایک بچے کی مسکراہٹ، پرندوں کے چہچہوں اور شام کے منظر سے لطف اٹھانے کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا، مگر ان کی ساری مصروفیت اس غلام کی سی ہوتی ہے جو آقا کی خدمت گزاریوں میں خود کو شامل نہیں رکھتا۔ آگے ہی آگے بڑھنے والے اکثر اپنے آپ کو اتنا پیچھے چھوڑ آتے ہیں کہ پھر نگاہ سے اوجھل اور پکار کی زد سے بہت دور پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ایک دوڑ میں اوّل آتے ہیں تو دوسری ریس میں اُن کا کوئی نمبر ہی

نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ایورسٹ پر پہنچ کر ایک گہری کھائی میں خود کو گرا پاتے ہیں۔

نمبروں کی نظر آ گے یعنی مستقبل پر جمی ہوتی ہے اور آخری آدمی پورے کا پورا حال میں موجود اور شریک ہوتا ہے۔ اوّل الذکر کے لیے حال، مستقبل کے حوالے سے بُرا یا بھلا ہوتا ہے۔ مگر آخری آدمی حوالوں اور نسبتوں کے چکر میں پڑ کر حال کی دھڑکتی کائنات کا مزہ کرکرا نہیں کرتا۔ اس کے لیے سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ وہ میدان میں موجود ہے۔ وہ چوں کہ حال کو اس کے سب رنگوں اور زاویوں میں جیتا ہے، لہٰذا ماضی اُس کے لئے ملال نہیں بنتا اور مستقبل کبھی اس کی دسترس سے باہر نہیں ہوتا۔

نئے موسموں کی ہوا

موسم کا ذکر چھڑ جائے تو ہوا کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہوا کے زور ہی سے موسم اپنا چولا بدلتا ہے۔ یہی نہیں موسم کو جہاں جہاں اپنے وجود کا اظہار کرنا ہوتا ہے، ہوا خون بَن کر موسم کی رگوں میں موجود رہتی ہے۔ حُسنِ موسم، خود آرائی اور خود نمائی کے لیے ہوا کا رہین منت ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ہوا آب سے آمیز ہو کر موسم پیدا کرتی ہے، وہاں وہ خود ایک جُداگانہ وجود اور تشخص کی حامل بھی ہے۔ یہ آمیز ہو کر بھی خود کو اپنے تشخص سے جُدا نہ کرنا انفرادیت ہے۔ ہوا میں یہ انفرادیت بدرجہء کمال موجود ہے۔

درخت جب پتوں کی کہنگی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے بے زار ہو جاتے ہیں اور سر جھٹک کر اس بوجھ کو اُتار پھینکنا چاہتے ہیں تو مدد کے لیے ہوا کو پکارتے ہیں۔ درختوں کی ہوا سے دیرینہ شناسائی ہے۔ درختوں کی پکار پر ہوا لپک کر آتی اور والہانہ پن کے ساتھ ٹہنیوں سے پرانے پتوں کا کمبل اُتار پھینکتی ہے۔ درخت اگلے ہی لمحے طمانیت وافتخار کے جذبے کے ساتھ سَر بلند ہو جاتے ہیں۔ مگر اس سے اگلے سمے جب ایک نظر اپنے آپ کو، ایک نظر چاروں اور بکھرے پتوں کو دیکھتے ہیں تو گھبرا سے جاتے ہیں، اپنے آپ کو برہنہ دیکھ کر۔ اس سے پہلے کہ اپنی برہنگی پر شرمندہ ہوں، وہ دور دور تک اپنے جیسوں کو، اپنی ہی طرح کی حالت میں پاتے ہیں، تو اطمینان کو سانس لیتے ہیں۔ ننگا پن صرف لباس والوں کی موجودگی ہی میں ننگا پن لگتا ہے! لیکن انھیں پتوں سے جُدا ہونے پر دکھ بھی ہوتا ہے۔ ایک عرصہ تک وہ درخت کی زینت اور درخت کے ارتقا میں ممد رہے

تھے، اور طویل مدت کے لیے بچوں کی طرح اس سے چمٹے رہے تھے۔ اب درختوں کو اپنی بے مائیگی کا احساس شدت سے ستانے لگتا ہے۔ وہ پرانے لباس کو ہی غنیمت سمجھنے لگتے ہیں، اور یہ منزل بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ درختوں کی زندگی میں بھی قوموں کی زندگی میں بھی۔ مگر تازہ ہوائیں آ کر نئے موسموں کی نوید سناتی ہیں۔ ہواؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر ان کی بشارت ابلاغ سے سرفراز ہو جائے تو درخت تازہ شاخوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ انتظار کی یہ کیفیت اس امر کا اعلامیہ ہے کہ درخت نئی کونپلوں کو قبول کرنے پر آمادہ اور قومیں آئینِ نو کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہیں۔

نئے موسموں کی ہوائیں کوئی پیغام نہیں لاتیں۔ مرزا غالب کی شاعری کی طرح تازہ ہواؤں میں واضح پیغام کے بجائے ایسی ''سرسراتی آہٹیں'' ہوتی ہیں، جن سے حظ اٹھانے کے لیے تربیت یافتہ ذوقِ سماعت کی ضرورت ہے۔ جب موسم اپنی تصویر کا دوسرا رخ دھرتی کی جانب کرتا ہے، خزاں کے ہاتھوں لٹنے والے خزاں کے دامن سے ہی پیار کے پھول چنتے ہیں، تو میں اس نئے موسم کی ہواؤں کے استقبال کے لیے کھیتوں کا رُخ کرتا ہوں۔ دھرتی کے بنجر پن کو چھپاتے گندم کے نَوخیز پودے آنکھوں میں جوت جگاتے ہیں۔ گندم کا ہر پودا خود کو سر بلند کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ ہوا سے مدد طلب کر رہا ہوتا ہے۔ میں اس مدد طلبی کا نظارہ کرتے ہوئے کھیت کے ایک کونے میں اُونچی جگہ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ چاروں اَطراف سبزہ کی بہتات پا کر ایک ایسے احساس میں بھیگ جاتا ہوں، جس کے زیرِ سطح خالقِ مطلق کا شکر ادا کرنے کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی اس لمحے کو گرفت میں لے لینے کی کامیابی پر شاداں و فرحاں بھی ہوتا ہوں، جس میں مجھے اس نظارگی کی اہمیت و حقیقت کا عرفان ملا تھا۔ تشکر اور شادمانی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبا ہوا، میں اپنے کانوں کو ہَوا کی سمت لگا دیتا ہوں، ہَوا جھوم کر میرے پردۂ سماعت پر نمودار ہوتی ہے اور ایک انسان سے مل کر خوشی سے کلیلیں کرنے لگتی ہے۔ اکثر لوگوں کو ہوا کا یہ عمل پسند نہیں ہے۔ ان کے کان اس ہنگامہ آفرینی کی تہ میں پنہاں مسرت سے آشنا نہیں ہوتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی قوم کا نظامِ خیال زنگ آلود ہونے لگتا ہے تو وہ نئے نظریات کو قبول کرنے میں ایسی ہی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہے، نئے نظریات بھی تو تازہ ہَواؤں کی طرح ہوتے ہیں جو موسم کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں، پھر وہ معاشرے کی فکری سطح پر کلیلیں کرتے ہیں، جس سے اکثر لوگ جھلا اٹھتے ہیں۔ مگر اس سے نظریے دَم نہیں توڑتے۔ نظریوں کی زندگی افراد کے عمل رَدِ

عمل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ وقت کے ایک خاص بہاؤ کے تحت پیدا ہوتے، پھولتے پھولتے اور عمرِ طبعی گزار کر رخصت ہوتے ہیں۔

میں اپنے کانوں کو ہوا کی سمت لگا دیتا ہوں، ہوا جھوم کر پردۂ سماعت سے ٹکراتی ہے، ہوا کے اپنے خاص سُروں میں مستور زمزمہ پیرائیوں میں مجھے اپنی روح کے لطیف، سبک اور سماوی ہونے کا احساس نہایت محبت اور شدت سے ہوتا ہے۔ میں شش جہت سے فطرت کے رنگوں اور نغموں میں گھر جاتا ہوں۔ ہوا اور روح میں بے طرح مماثلت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہوا کی تازگی روح کے اَن دیکھے گوشوں سے آشنا کرا جاتی ہے۔ میں بالکل ایک دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ یہ جہانِ نَو ایک ایسی بلندی پر واقع ہے جہاں سے دُنیا بازیچۂ اَطفال نظر آتی ہے۔ یہ اس روحانی نشاطیہ کیفیت ہی کا ثمر ہے کہ حوصلے اور عزم کی جوہری توانائی ہاتھ لگتی ہے۔ فطرت حوصلوں اور عظمتوں کے اجزاء سے ہی ترکیب پاتی ہے۔ فطرت سے قریب ہونا ہی فطرت کے ترکیبی عناصر کو اپنے من میں جذب کرتا ہے۔ اس انجذاب کے بعد ہی انسان تخلیق کا منصب سنبھال سکتا ہے۔

☆☆☆

دائرہ در دائرہ

دائرہ زندگی کے گرد اپنے مضبوط بازو حمائل کیے ہوئے ہے۔ زندگی بازوؤں کے اس حلقے سے رہائی کی جتنی تگ وتاز کرتی ہے، دائرہ اسی نسبت سے اپنا حلقہ تنگ کرلیتا ہے۔ یوں دونوں میں ایک ایسی کشمکش کا منظر وجود میں آتا ہے جس کا مشاہدہ ہم اپنی روزمرہ زندگی اور تاریخ میں کرتے ہیں۔ دائرے کا کام اپنے محیط میں آنے والی چیزوں کے جملہ رابطوں اور سلسلوں کو خود میں جذب کرلینا ہے، جب کہ زندگی اپنے فطری جذبۂ بقا کے تحت کسی غیر کے تسلط سے اس طرح پرہیز کرنا چاہتی ہے جس طرح شوگر کا مریض میٹھی اشیا سے۔ تاہم دائرے میں دوشیزہ کے پیار کی طرح لافانی کشش بھی ہے جو زندگی کے کروفر کو مصلوب کرنے میں اکثر کامیاب رہتی ہے۔ زندگی دائرے سے بھاگتی بھی ہے، مگر جگہ جگہ دائرے کے بچھائے ہوئے جال میں بڑی معصومیت سے گرفتار بھی ہوتی جاتی ہے۔ یوں دونوں میں ایک ایسی کھینچا تانی کا آغاز ہوتا ہے، جس کا انجام معلوم نہیں ہے۔ دائرہ بھی آغاز وانجام کے چکر سے آزاد ہے اور زندگی بھی اپنے آغاز وانجام کی بابت کچھ نہیں جانتی۔

آغاز اور انجام دو ایسے نقطے ہیں جن کا وجود معدوم ہے۔ کوئی چیز کہیں سے زقند بھر کر ایک جگہ ذرا دیر کو رُکتی ہے تو ہم اسے آغاز سفر کا منظر قرار دے ڈالتے ہیں۔ نقطے کے وجود کو برحق ماننے کے لیے قیام اور ٹھہراؤ کو ثابت کرنا ضروری شرط ہے، جب کہ قدرت کے کارخانے میں سکون اور ٹھہراؤ نام کی کسی چیز کا وجود ہے ہی نہیں۔ اسی طرح جس نقطے کو ہم انجام کا منظر تصور

کرتے ہیں، وہاں سے کوئی چیز سفر کرتی ہوئی کوئی موڑ عبور کر جاتی ہے۔ آغاز و انجام کے دقیق فلسفیانہ مباحث کو سمجھنا ہو تو اِس ضمن میں دائرے کی خدمت مستعار لی جا سکتی ہیں۔ دائرہ مسلسل اور کبھی نہ رُکنے والے سفر کے جنوں میں مبتلا زندگی کی طرح جانے کس منزل کی طرف بھاگ رہا ہے! اس کے گول وجود پر لاتعداد نقطے براجمان ہیں اور ہر نقطے پر گمان ہوتا ہے کہ اس کے مجنونانہ سفر کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔ لیکن جوں ہی آگے بڑھتے ہیں، اس سے اگلا نقطہ بھی ہمیں اسی وَہم میں ڈال دیتا ہے۔ انجام کی بابت بھی ہماری کوشش اِسی طرح بے ثمر رہے گی۔ آغاز و انجام کو بھول کر ہم دائرے کے گول مٹول وجود کی ماہیت سمجھنے کے برعکس ایک ایسے خالی خُولی احساس سے دوچار ہو جاتے ہیں جس کا مظاہرہ دائرے کی اندرونی کائنات (O) میں ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کے سفر کی داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ زندگی بغیر کسی منزل کے واضح تصور کے ایک صبر آزما سفر طے کر رہی ہے۔ بظاہر لگتا ہے، ہمارا سفر ایک خاص منزل کو پا لینے کے شوق کی دین ہے۔ ہم اس منزل کی جانب دیوانہ وار دوڑتے ہیں۔ ہمارے پاؤں میں راستے کی دُھول زمین سے اُٹھ اُٹھ کر ہمیں منع کرتی ہے اور یہ فریاد کرتی نظر آتی ہے کہ اے شخص، تُو کس کی خاطر دد یوانہ وار بھاگا جا رہا ہے، رُک جا آگے کچھ نہیں ہے! مگر انسان اسے راستے کی رکاوٹ سمجھ کر، قدموں تلے رَوندتا اپنی مزعومہ منزل تک پہنچتا ہے۔ مگر جب پہنچتا ہے اور ابھی دَم بھی نہیں لے پاتا کہ مایوس ہو جاتا ہے، دائرے کے نقطے کی طرح منزل کا نشان بھی موہوم ہوتا ہے۔ اُس سے تھکے ہارے مسافر کے پاس ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کی ہی قوت باقی رہی ہوتی ہے، ذرا سی دیر بعد منزل کے شوق میں مارا مارا پھرنے والا مسافر اتنا ہی جان سکتا ہے کہ میں نے دراصل کوئی سفر نہیں کیا، بلکہ دائرے میں گھومتا رہا ہوں، جہاں سے چلا تھا وہیں آ گیا ہوں۔

مگر انسان نے اس دائرے کے طوق کو گلے سے اتار پھینکنے کی ہمیشہ سَعی کی ہے۔ دائرہ سفر کی بے معنویت کا استعارہ ہے۔ سفر جو تنوع، تازگی اور نئے پَن ایسے اُشمار کا امین ہے، دائرے سے "عقدِ شرعی" کر کے ایسے ہی بانجھ ہو جاتا ہے، جس طرح رُومانی مزاج کا نوجوان شادی کے بندھن میں اسیر ہو کر خوب تر کی تلاش سے محروم ہو جاتا ہے۔ دائرہ جب پوری طرح انسانی زندگی کے رویوں کو اپنے مخصوص مزاج کے تابع کر لیتا ہے تو زندگی اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ زندگی اور تہذیب کے ارتقائی سفر کی کہانی دراصل دائرے کے قلعے سے رہائی پانے کے

واقعات سے مرتب ہوئی ہے۔

فنکار اور مفکرین ایسے باغی ہیں جو دائرے سے اپنی فوجیں نکال کر لے جاتے ہیں۔ جب کوئی قوم زندگی کے ایک ہی ڈھب، ایک ہی اُمنگ اور ایک ہی طرح کے مزاج کی حکومیت اختیار کر لیتی ہے، تو وہ دراصل دائرے کی حاکیت تلے پسنے لگتی ہے۔ اس کے عقائد میں جان باقی نہیں رہتی، مردہ رسموں کی بے چُون وچرا پابندی کو ایمان سمجھتی ہے، اپنے آباؤ اجداد کی کھینچی ہوئی لکیروں کی فقیر ہو جاتی ہے۔ اس کی سوچ کا سفر رُک جاتا اور اس کے محسوس کرنے کے انداز میں میکانکیت آ جاتی ہے۔ اس مزاج کی قوم کی تہذیب مَرنے کے قریب پہنچ جاتی ہے، مگر ابھی اُس قریب المرگ تہذیب میں زندگی کے چند سانس باقی ہوتے ہیں اور دائرے کے شکنجے میں ابھی وہ آہنی اور ناقابل شکست سختی نہیں پیدا ہوئی ہوتی کہ کسی تخلیقی شخصیت کا ظہور ہو جاتا ہے جس کے ہاتھ میں وہ عصا ہوتا ہے جو تہذیب کے گلو میں پڑے طوق کو توڑ دیتا ہے۔ زندگی کے فرسودہ رویوں پر کاری ضرب لگتی ہے۔ ایسی تخلیقی شخصیت زندگی اور تہذیب پر آکاس بیل کی طرح چھائے ہوئے دائرے کے جال کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فنکار بھی اس ''کارِ خیر'' میں دائروی رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دائرہ ایک ایسے کوزہ پشت بوڑھے کی طرح ہے جو صرف اپنی ذات پر توجہ مرکوز رکھتا ہے جو ایک طرح سے ارتکاز کی ہی صورت ہے۔ تخلیقِ فن میں اِرتکاز کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، بلکہ تخلیق کا سارا کاروبار ارتکاز کی ریل پیل ہی سے چلتا ہے۔ فنکار جن تاثرات کی نقاشی کرتا ہے وہ اُسے پوری شدت کے ساتھ اپنے سینے سے چمٹا لیتے ہیں۔ یوں فنکار ایک ایسے بچے کی طرح ہے جو اپنی ذات کے بچاؤ کے لیے اپنی ماں سے یُوں لپٹ جاتا ہے کہ ماں کی شخصیت اُس کے احساس کے رَگ وپے میں اُتر جاتی ہے۔ تاثرات فنکار کو اس طور اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں کہ فنکار کو اپنے بچاؤ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ان جذبات کا اظہار ہی زندگی اور تہذیب کو دائرے کے تسلط سے آزادی دلانے میں ایک مجاہد کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کا تضاد ہے، مگر زندگی تو ہے ہی تضادات کا مجموعہ!

دائرہ ایک نابینا شخص ہے جو خارج کی روشنی کے شعور سے محروم مگر اپنے داخل کی روشنی سے سرفراز ہوتا ہے۔ دائرہ اپنی ذات کے زنداں میں اس حد تک قید ہے کہ وہ باہر جھانکنے کی

سے اپنے سارے رابطے منقطع کر لیے ہوتے ہیں اور صرف اپنی ''مَیں'' کی طرف جھکا رہتا ہے۔ شاید یہ مراقبہ اس لیے ہے کہ ذات کے اندر بھی روشنی کا ایک سرچشمہ ہے، جو اگر دسترس میں آ جائے تو پھر خارج سے ٹوٹے ہوئے رشتے بھی استوار ہو سکتے ہیں۔ صوفیا پہلے خود سے آگاہ ہوتے ہیں، پھر کائنات کے گنجلک سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کائنات کی ''بجھارت'' بھی ایک دائرے ہی سے مشابہ ہے۔ دائرہ فطرت کی خصوصی منشا کا مظہر ہے، مظاہرِ کائنات پر دائرہ کا رنگ نہایت شوخ ہے۔ سیارے مسلسل اپنے مدار اور اپنے سورج کے گرد دائرہ بنائے گھومتے ہیں۔ موسموں کا تغیر وتبدل بھی اپنے خدوخال کے اعتبار سے دائرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ گرما، سرما، بہار، خزاں، موسم اس ایک دائرے میں متواتر گھومتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں بھی دائرے بنتے، دائرے بگڑتے اور پھر دائرے صورت پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت نے نوعِ آدم پر دائرے کا ایک جال پھینک دیا ہے۔ ہر نیا وجود اس دائرے کو اپنے گلے میں طوق کی طرح پڑا پاتا ہے۔ ہر شخص تقریباً ایک ہی رنگ اور مزاج کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا، یہ دائرہ ہر فرد کا مقدر ہے مگر وہ افراد، جن میں جوشِ زندگی فزوں تر ہوتا ہے، اس دائرے کے حصار سے باہر کود جانے میں کوشاں رہتے ہیں، ان کی نگاہیں ہمیشہ تازہ اور پُر شباب زندگی کے خوابوں سے چمکتی رہتی ہیں۔ بھرپور تخلیقی توانائی کے حامل یہ لوگ بالآخر اپنی ہستی پر مسلط دائرے سے نجات پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ زندگی، جب تک باقی رہتی ہے،'' ان کی نجات کے اَثمار'' سے اپنی جھولیاں بھرتی رہتی ہے۔

دائرہ تحفظات فراہم کرنے اور بقا و استحکام عطا کرنے کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ چناں چہ ساج بالخصوص اپنی زندگی جاوداں کے لیے لاتعداد دائروں کی تشکیل کا اہتمام کرتا ہے۔ ساج افراد کو مُتحد و منظم اور یکجا رکھنے کے لیے رُسوم و رواج کا نظام قائم کرتا ہے۔ عقائد و اطوار میں اُس وقت تک مخصوص بُو باس جنم نہیں لے سکتی جب تک یہ دائرے کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو جائیں۔ یہ ایک اندھی خواہش ہے جس کا ساج کو شعور نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ ساج کے جبر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ معاشرے کے دائرے میں کولہو کے بیل کی طرح گھومتے چلے جانے پر آمادہ نہیں ہوتے، چناں چہ وہ اس دائرے کی مضبوط دیواروں میں نقب لگاتے ہیں یا

سرِ عام ان دیواروں کو پھاند جاتے ہیں۔ سماج بھگوڑوں کو دوبارہ ہانک کر باڑے میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اِس میں کامیاب نہ ہو تو انھیں باغی قرار دے ڈالتا ہے۔

گزرے لمحوں کی کوئی یاد جوں ہی ذہن کے کسی کونے کھدرے سے سَر نکالتی اور اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے، سطحِ ذہن پر اَن گنت دائرے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کسی تالاب کے پُر سکون، ٹھہرے پانی میں کوئی پتھر گر کر دائرں کو کروٹ دیتا ہے، اور تالاب کی سطح جی اُٹھتی ہے، اسی طرح یادیں بھی اِنسانی ذہن میں ننھی مُنی خوبصورت لہریں پیدا کرتی ہیں۔ ایک یاد کی شمع سے کوئی دوسری جَل اٹھتی ہے اور پھر وہ کسی تیسری یاد کو رَوشن کر دیتی ہے، اور یوں یادوں کے نورانی دائرے بنتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اِنسان ان دائرں کے حُسن میں کھو کر ''حال'' سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بے خُودی کی ہر کیفیت جس میں حال کی تلخیوں کو بھلا ڈالنے کی بے پناہ سکت ہے، انسان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

☆☆☆

بے کاری اور بے روزگاری

بیکاری آسمان سے اُترنے والی وہ پُر تر کیفیت ہے جس کی شان میں قصیدے پڑھے جانے چاہئیں، جب کہ بیروزگاری سماج کی کوکھ سے جنم لینے والی کالی ڈائن ہے جو افراد کی عزت نفس اور جان کو اپنے خوں آشام پنجوں سے تار تار کر کے رکھ دیتی ہے۔ بے کاری ہر آسمانی چیز کی طرح نہایت رازداری کے ساتھ ایک شخص پر اُترتی اور اُس کی ذات میں اطمینان و مسرت کے شگوفے کھلا جاتی ہے اور انھی شگوفوں کی خوشبو سے پورا معاشرہ مہکنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس بے روزگاری ایک زہر ہے جو انسان کی شریانوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ بے روزگاری کی زَد میں آئے ہوئے معاشرے کا باطن کھوکھلا، بدبودار اور ظاہر نفرت، جرائم اور انتقام سے لیس ہوتا ہے۔ بے روزگار افراد تپتے صحرا میں ننگے پاؤں چلنے والی ان بلیوں کی مانند ہیں جو پاؤں جلنے پر اپنے ہی بچوں کو تلوؤں کے نیچے ڈال دیتی ہیں۔

دوسری طرف بے کاری خوف اور تردد سے عاری وہ کیفیت ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان زندگی کی بہترین مسرتوں کے ذائقے سے آشنا ہوتا ہے۔ زندگی کی بالائی سطح تصادم سے عبارت ہے۔ افراد، اشیاء، نظریات اور آدرش اپنی بقا اور بہتری کے لیے مسلسل ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ ہر شے اپنے مقابل کو تسخیر کرنے کے لیے اپنے اعصاب کی پوری قوت اور اپنے دماغ کی ساری شیطانی چالیں بروئے کار لا رہی ہے۔ نتیجہ کان پھاڑنے دینے والا شور و غل اور موت کی اَرزانی ہے۔ بے روزگاری ہمہ گیر آویزش کے اسی ماحول سے بڑے قدرتی انداز میں جنم

لیتی ہے۔ بے روزگاری دراصل عورت کی کوکھ سے جنم لینے والا وہ ناجائز بچہ ہے، جسے فسادِ خلق کے
خوف سے گندگی کے ڈھیر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ غلاظت بھرے ماحول میں پرورش پانے کی بنا
پر اس کا ذہن منفی، اور گلی سڑی اقدار کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ یوں جسے فسادِ خلق کے اندیشے سے
کوڑے کے ڈھیر پر ''ضائع'' کرنے کی کوشش کی گئی تھی، وہ ہر لحہ ''دلِ خلق'' میں کانٹے کی طرح
کھٹکتا ہے۔ بے کاری جنگِ بقا کے اسی عالم سے، رات کو سر سے گزرنے والے خوش بختی کے
پرندے کی طرح نمودار ہوتی اور انسان کے دل میں سما جاتی ہے۔ آدمی کو جنگ کے شور و غل اور
مرنے مارنے کے عمل سے شدید بے زاری ہو جاتی ہے، وہ اپنی ایک الگ راہ اپناتا اور زندگی اور
فطرت کی اَن دیکھے منطقوں کی سیاحت کے لئے چل پڑتا ہے، اور اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ
اُن خیالات و تصورات میں جو نان و نفقہ کے جھگڑوں سے قطعاً لاتعلق ہوں، کتنا حُسن اور حیات
آفرینی ہے، اور اس کے ساتھ ہی بے کار آدمی پر زندگی میں لگی پُو ہا دوڑ کی لایعنیت کا پول بھی
کھلتا ہے۔ وہ شاید چوہوں کو دَوڑنے سے روک تو نہیں سکتا، مگر خود چوہوں کی لامتناہی قطار سے
الگ ضرور ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنے گزشتہ سفر کے ہمراہیوں پر نہ تو طنز کے تیر
چلاتا ہے اور نہ اپنے ماضی پر ندامت محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں دَرگزر کرنے کا ایک توانا
جذبہ جنم لیتا ہے۔ بے کاری انسان پر بنیادی اہمیت کے متعدد راز آشکارا کرتی ہے۔ روٹی، کپڑے
اور مکان کی جنگ سے بھاگا ہوا آدمی جب غالباً پہلی بار سورج کو بلا اِمتیاز سب پر روشنی
نچھاور کرتے اور ہوا کو انسان کی بنائی ہوئی طبقاتی حد بندیوں سے ماورا ہو کر ہر جگہ چلتے محسوس
کرتا ہے تو اس کا دل بھی محبت کے لامحدود جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، اور وہ انسانوں کو ان کی
کجیوں سمیت پیار کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ یوں دیکھئے تو بے کاری حال کے لمحے سے پیار اور
خوشی کشید کرنے کا ہُنر سکھاتی ہے۔ اس کے برعکس بے روزگاری لمحۂ حاضر سے نفرت کا درس دیتی
ہے۔ بے روزگاری میں یہ کُرۂ ارض سمٹ کر روٹی، کپڑا اور مکان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی بن جاتا
ہے، جسے بے روزگا، ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، خواہ اس کے لیے اخلاقی اور سماجی حد
بندیوں کو توڑنا ہی . ..ں نہ پڑے! بے روزگار آدمی کے خواب و خیال پر اسی چھوٹی سی پوٹلی کا قبضہ
ہوتا ہے، جس میں مستقبل کے جانے کتنے سہانے سپنے بند ہوتے ہیں۔ وہ اسے ایسی کلید بھی سمجھتا
ہے، جس کی مدد سے سماجی اسٹیٹس کا بھاری مغلیہ طرز کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔

بے کاری کا تجربہ، آدمی کو مزاج کا دھیما پن عطا کرتا ہے جب کہ بے روزگاری طبیعت میں تلخی، غصہ اور چیزوں کو توڑنے پھوڑنے کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ بے کاری نئی اَخلاقی اور جمالیاتی قدروں کی تخلیق کی ضامن ہے جب کہ بے روزگاری پختہ اَقدار کے سالم نظام کو تہس نہس کرنے پر مستعد رہتی ہے۔

بے کاری اور بے روزگاری زندگی سے متعلق دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ بے کاری زندگی کی سادگی پر ایمان اور بے روزگاری زندگی کی پیچیدگی کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ زندگی کی ہاؤہُو میں گھرا ہوا شخص جب اچانک بے کاری کی کیفیت سے فیض یاب ہوتا ہے تو خود کو ہوا کی طرح سبکسار محسوس کرتا ہے، اور ہوا کی طرح وہ بلا امتیاز اپنے بھائی بندوں اور فطرت کے متنوع مناظر سے معانقہ کرتا ہے، ان سے کچھ اپنی کہتا اور کچھ اُن کی سُنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اپنے اور دوسروں کے مابین فاصلے کی جو دیوار اٹھا رکھی تھی، وہ ڈھے جاتی ہے اور سینہ چاکانِ چمن ایک دوسرے سے آملتے ہیں۔ بے روزگاری میں انسانوں کے درمیان فاصلے کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بے روزگار ایک بند، سیلن زدہ کوٹھڑی میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ ان دیواروں میں بہت سے چور دروازے بنا لیے جاتے ہیں، جن میں سے خوف اور عدَم تحفظ کے گرد باد بھی داخل ہوتے اور کوٹھڑی کے قیدیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ واللہ اعلم!

بے کار آدمی زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہے، اس لیے وہ زندگی کے نئے نئے ذائقوں کی دریافت کرتا ہے۔ وہ اس جہانِ رنگ و بُو پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ ایک پُراسرار جذبے کی تحریک پر نئے جہانوں کی تسخیر کا خواب دیکھتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری تمدنی اور ثقافتی اور علمی ترقی بے کاری کا ہی ثمر شیریں ہے۔ قدیم زمانے میں جب لوگوں کے پاس فرصت اور فراغت کی فراوانی تھی تو وہ مظاہر فطرت سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے اُن پر فکر و غور کرنے لگتے۔ بساطِ آسماں کے مطالعے کو انھوں نے مشغلے کے طور پر اپنایا تھا۔ جدید اِنسان نے اُن کے اِسی شغل سے عِلمِ فلکیات کے بنیادی تصورات اَخذ کیے۔ طویل راتوں کی فرصت میں قدیم انسان نے عجیب و غریب طلسماتی کہانیاں گھڑی تھیں۔ آج کا انسان انھی اساطیری کہانیوں میں دانشِ تلاش کر رہا ہے، اور یہ بے کار آدمی ہی تھے جنھوں نے سیر و سیاحت کے ذریعے کُرہ اَرض کے چُھپے مقامات کو دریافت کیا اور اپنے ہم وطنوں کو نئے جہانوں کی حیرت انگیز باتیں بتائیں۔ مارکو پولو، ابن بطوطہ،

کولمبس وغیرہ نہ ہوتے تو آج قدیم دُنیا کے کتنے ہی اَسرار ہماری گرفت میں نہ ہوتے۔ دراصل قدیم زمانے کا بے کار آدمی خُود کو فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ کیے ہوئے تھا۔ اس لیے اُس کے فکر و عمل میں تضاد اور اِنتشار نہیں تھا۔ وہ ایک بے حد پُرسکون اور مطمئن روح تھا۔ کتاب، موسیقی، رقص، شاعری اور تصویر سازی کے لیے بے کار آدمیوں کو دعائیں دیجیے۔ بے کاری آدمی کو آسُودگی کی جو کیفیت عطا کرتی ہے وہ نئے خیالات، نئی اشیا، کی تخلیق کے لیے ازبس ضروری ہے۔ دیکھیے بے کاری کتنی معنی خیز اور معنی آفریں ہے!

میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر زندگی میں اطمینان اور آسُودگی کو پھر سے رواج دینا ہے تو لوگوں کو بے کار رکھنے کے باقاعدہ منصوبے بنانے چاہئیں۔ سیاستدان اکثر خود کو مصروف رکھنے کی خاطر عوام کی تقدیر سے کھیلتے ہیں۔ اگر اِن سب کو ایک سال کی چھٹی پر افریقہ کی سیاحت پر بھیج دیا جائے اور یہ خاص احتیاط کر لی جائے کہ اُن کے ساتھ ٹی وی کیمرے اور اخباری رپورٹر نہ ہوں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وطنِ عزیز کے عوام اِطمینان اور تحفظ سے بہرہ یاب ہو سکیں گے۔ رہ گئے افریقہ والے تو ان کے ساتھ اِظہار ہمدردی ہی کیا جا سکتا ہے!

بوریّت

میں مہینے میں ایک آدھ مرتبہ بور نہ ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ جس طرح کسی عزیز دوست سے ملاقات میں وقفہ طویل ہو جائے تو وَسوسے اور گمان شریر بچوں کی طرح تنگ کرنے لگتے ہیں، اسی طرح بوریت کی ''آمد'' زیادہ عرصے تک نہ ہو تو مجھے تشویش ہونے لگتی ہے۔ مبادا بوریت کی شان میں مجھ سے گستاخی سرزد ہو گئی ہو! چناں چہ میں بوریت کی ''آمد'' سے مایوس ہو کر ایک پروفیشنل شاعر کی طرح اس کے ''آورد'' کا اہتمام کرنے لگتا ہوں، اور گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ اِلا ماشاءاللہ مجھے بوریت گھر کے کونوں کھدروں میں بسیار کوشش کے باوجود نہیں ملتی۔ شاید اس لیے کہ میرے دو ننھے بچوں نے اپنی ''موجودگی'' سے سارے گھر کو یُوں بھر دیا ہے کہ کسی دوسری شے کے لے جگہ ہی نہیں بچی، میرے لیے بھی نہیں!!

مجھے راستے میں جگہ جگہ بوریت کا سامنا ہوتا ہے۔ کہیں بوریت پان چباتے ہوئے، کہیں چائے کے گھونٹ کے ساتھ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے، کہیں اُونچی آواز میں فلمی گانے سنتے ہوئے اور کہیں کسی ٹی ہاؤس میں ادبی، سیاسی، علمی اور معاشی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ ہوٹل اور شاپنگ سنٹر، پارک اور سینما گھر سب بوریت کی ''علاج گاہیں'' ہیں مگر میں کسی ایسی علاج گاہ میں داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ میں تخلیے میں بوریت سے جی بھر کے باتیں کرنے کی آرزو میں گھر سے نکلتا ہوں۔ دراصل ایک طویل عرصے تک بوریت ایک نادیدہ دشمن کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوتی رہی۔ یہ چھپ کر وار کرتی تھی،

اس لیے ہر وار نشانے پر لگتا اور میں پہروں اِس کے زخم سہلاتا رہتا یا پھر ''علاج گاہوں'' میں ''داخل'' رہتا۔ بے روزگاری کے دنوں میں تو یہ چھل پَری کی طرح مجھے خوب زِچ کرتی۔ مگر پھر مَیں نے ایک منتر سیکھ لیا اور اس چھل پَری کو اپنے قابو میں کرلیا۔ میں یہ منتر افشا کر کے منتر کی طلسمی قوت کو کھونا نہیں چاہتا۔ ویسے خلق خدا کی بھلائی کے لیے بوریت سے اپنی شناسائی کی کتھا کو ضرور منظرِ عام پر لانا چاہتا ہوں۔

مَیں ایک مصروف آدمی ہوں، میری مصروفیت ایک صحافی کی مصروفیت سے مختلف ہے، جو بے چارہ دِن رات دیواروں سے اپنے خفیہ مائیک کا ''کان'' لگائے خبریں بنانے کا چکرا اپنے پاؤں میں لیے پھرتا ہے۔ میری مصروفیت کا ایک پیشہ وَر، مشاعرہ باز شاعر کی مصروفیت سے بھی کوئی تعلق نہیں جو گم نام شاعروں کے کِرم خوردہ دواوِین کی چوری چھپے وَرق گردانی کرتا رہتا ہے تاکہ مارکیٹ میں نئی کتاب لا سکے۔ میری مصروفیت کالج پڑھانا، دوست احباب سے ''نصف '' یا پوری ملاقات یا اس کا انتظار کرنا، اپنے بچوں سے دنیا کی وہ زبان سیکھنا جسے آدم نے زمین پر پہلے پہل ذریعۂ اظہار بنایا تھا، یا پھر اندر کی وادی میں بھٹکتی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنا ہے۔ بوریت کو میری یہ مصروفیت زہر لگتی ہے وہ اسے رقیب رُوسیاہ سمجھ کر تب تک میرے پاس نہیں آتی جب تک میرا پہلو اس سے آباد ہو۔

بوریت کی آمد پرانی داستانوں کے دیو کی طرح ہے۔ پہلے اندھیرا چھا جاتا ہے، آدمی کے روزمرہ کو بریک لگ جاتے ہیں، اندر کی رفتار مدھم پڑ جاتی ہے، چیزیں اور لوگ ایک دَم بے رونق ہو جاتے ہیں، مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہی اندھیرا لو دینے لگتا ہے اور آدمی خُود شناسی کی سعادت پالیتا ہے۔

مجھ پر پہلی بار کُھلتا ہے کہ بوریت اصلاً ایک احتجاجی اور دفاعی عمل ہے۔ جس طرح نزلہ اگر باہر کے بجائے اندر گرنے لگے تو گلا اس یلغار کے جواب میں کھانسی کی توپ چلانے لگتا ہے ، اسی طرح انسان اگر اپنی بے بہا صلاحیتوں اور قوتوں کے عساکر کو جنگی مشقوں یا پچ مُچ کی جنگ سے ہٹا کر بیرکوں میں بند کر دے اور اُن کے روزمرہ کو کھانے، پینے اور سونے کی مثلث کا قیدی بنا دے تو یہ احتجاج پر اتر آتی ہیں، بس یہی بوریت ہے۔

آپ نے رات کے کسی ویرانے میں اُلوؤں کو تیز تیز گفتگو کرتے ضرور سنا ہوگا۔ کسی

اُداس پہاڑی پر چرواہے کو ٹپے گاتے یا بانسری بجاتے بھی۔یقیناً سُنا ہوگا اور شاعر کو نقاد کی کم نگہی پر واویلا مچاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا کہ نقاد کو کلامِ غالب کی خوبیاں موصوف کی شاعری میں کیوں نظر نہیں آئیں، حالانکہ اس نے چُن چُن کر انھیں جمع کیا تھا۔اُلو کسی بین الاقوامی مسئلے پر انسانوں سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کرتے، چرواہا فقط بجنی کو یاد نہیں کرتا اور شاعر کو واقعی نقاد کی بے بصیرتی کی شکایت نہیں ہوتی بلکہ یہ سب اپنی بوریت کا حل تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔البتہ ذہنی سطحوں کے فرق کی وجہ سے حَل کی نوعیت میں فرق آنا لازمی ہے۔

بوریت چوں کہ ''اندر'' کا احتجاج ہے، اس لیے یہ ایک مثبت کیفیت ہے۔جس طرح خوابوں میں خونی ڈریکولا یا ڈائن ہی کیوں نہ نظر آئیں یہ آدمی کو اس کے اندر کی جذباتی اور رادرا کی صورتِ حال کی خبر دیتے ہیں اور انسان اگر خود سے واقفیت کا ہُنر رکھتا ہو تو خوابوں کے تجزیے سے وہ نہ صرف اپنی اصل شخصیت کا راز پالیتا ہے بلکہ ذاتِ انسانی کی گرہ کُشائی میں بھی کامیاب ہوسکتا ہے، اسی طرح بوریت وہ جامِ جمشید ہے جس میں انسان کو اپنی وہ قوتیں پابندِ سَلاسِل نظر آتی ہیں، جنھیں مَیدان عمل میں ہونا چاہیے تھا۔انسان اسی بات سے ابھی پوری طرح آگاہ نہیں ہو پایا کہ وہ اصلاً عمل پسند ہے۔بےکار بیٹھنا یا شیخ چلی کی طرح خوابوں کے سہارے گزر بسر کرنا یا کسی بوڑھے کی طرح ماضی کی جُگالی کرنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اِنسان فطرتاً ایک ''کمھار'' ہے جو مٹی سے اپنی ذات کے چاک پر طرح طرح کے ظروف بنانے میں مصروف رہنا چاہتا ہے اور پھر کچے برتنوں کو ''آوی'' میں پکا کر سر بازار لانے کی خواہش بھی رکھتا ہے، تاکہ اس نے اپنے اندر کے جس نقش کو مٹی میں ڈھالا ہے، لوگ اس کی تحسین اور پذیرائی کریں۔یہ ''کمھار'' دراصل انسان کے ابتدائی زمانے کی یادگار ہے، جب اُسے زندہ رہنے کے لیے دِن بھر دوڑ دھوپ کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرنا ہوتی تھی۔رزق نہ بھی ملتا تب بھی وہ انسان پُرسکون نیند لیتا تھا کہ اس نے ایک بھرپور عملی دن گزارا ہوتا۔بوریت اس زمانے کے انسان سے قطعی اجنبی تھی!

میں جب دُنیا کے پہلے بور آدمی کا تصور کرتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک اَدھیڑ عمر شخص کی تصویر آتی ہے، جس کے سارے کام اس کی جواں اُولاد یا نوکروں نے سنبھال رکھے ہیں۔وہ سَرما کی خوشگوار دھوپ میں تنہا چارپائی پر تکیے کی ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔پہلے وہ دھوپ

سے حظ کشید کر کے خوش ہوتا ہے مگر پھر ایک دَم اس کے اندر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چار پائی پر پہلو بدل بدل کر جب اُوب جاتا ہے معاً اُس کے ذہن کے کسی نامعلوم مقام پر کوندا اترتا ہے۔ وہ دُور کھڑے نوکر کو آواز دیتا ہے اور اُسے کہتا ہے جاؤ وہ خشک پتے لاؤ جو میں نے چند دن پہلے تمہیں دھوپ میں سکھانے کے لیے دیے تھے اور گاؤں کے کمہار سے دو ظروف بھی لے آؤ۔ یُوں حُقے کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ حُقہ اور اس کی فرع سگریٹ بور آدمی کی تخلیق ہے۔ پھر بزرگوار جب حُقے سے بھی اُکتا گیا تو دو نوکروں کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ آج سے تم میرے اِن مُوڑھوں پر بیٹھا کرو حقہ پیو اور مجھ سے گپ شپ کیا کرو۔ یوں میراثی، بھانڈ اور قصیدہ گو وُجود میں آئے۔ انسانی سماج نے جب مزید ترقی کی، بوریت نے طوائفوں سے لے کر قہوہ خانوں اور داستان گوؤں سے لے کر جدید پاپ سنگروں کو جنم دیا۔ یوں بوریت نہ صرف انسان کو اپنی بے عمل قوتوں سے متعارف کرواتی ہے بلکہ یہ متعدد تفریحی، سماجی اداروں کی تخلیق کا سرچشمہ بھی ثابت ہوئی ہے۔

بوریت کو ہمارے زمانے نے طرۂ امتیاز کی طرح سر پہ سجا رکھا ہے بلکہ سوار کر رکھا ہے۔ انسان تسخیرِ فطرت کے پاگل پن اور آسائش پسندی کے کریز میں سائنسی ایجادات کے ڈھیر لگاتا چلا گیا ہے۔ اور اب یہ حال ہے کہ وہ اپنی ہی ایجادات کے ہاتھ میں اِک کھلونا ہے۔ صبح کا اخبار نہ دیکھ لے تو ناشتہ ہضم ہوتا ہے نہ دن کے ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ اخبار دیکھ لینے سے دن کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے)۔ ایک آدھ میل تک جانے کے لیے گاڑی نہ ملے تو پیدل چلنے میں عار محسوس کرتا ہے، رات کے پہلے پہر تک ٹی وی نہ دیکھے تو نیند نہیں آتی۔ انسان نے اپنی آنکھوں، ہاتھوں اور پاؤں کو استعمال کرنا چھوڑ ہی دیا ہے، گویا جنگلی گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ دیا ہے۔ چناں چہ اب وہ خوفزدہ بھی ہے اور بور بھی! اگر یہی حالت رہی تو وہ دن دُور نہیں جب فطرت انسان سے اس کے ہاتھ پاؤں واپس لے لے گی، کیونکہ ارتقا کے ایک نظریے کے مطابق جو عضو ''زائد'' ہو جائے وہ آئندہ نسلوں میں محض نشانی کے طور پر باقی رہ جاتا ہے۔

انسان اپنے اندر قدر اور مقصد کا ایک متبرک احساس رکھتا ہے، جو اسے اُوپر سے اُوپر اٹھنے کی سدا ترغیب دیتا رہتا ہے۔ انسان دنیا کی دلدل میں گھٹنوں تک اُترا ہوا ہے۔ یہ احساس اسے آزاد ہونے کی راہ سجھاتا ہے۔ انسان اگر اس احساس کی صدا پر لبیک نہ کہے تو وہ مزید نیچے

اُتر سکتا ہے۔اس دنیا میں اربوں، کھربوں انسان غالباً طبعی کاہلی کی وجہ سے کچھ ایسے دھنس گئے کہ تاریخ کے کسی ادنیٰ سے گوشے میں بھی اُن کا نام تک نہیں ملتا۔مگر جنھوں نے ''آزاد'' ہونے کا عمل مسلسل جاری رکھا، آج وہ ستاروں کی طرح ہر نسل کو نہ صرف دور سے نظر آتے ہیں بلکہ ساری روشنی کا ماخذ بھی وہی ہیں۔بوریت دراصل دنیا کی دلدل میں اُترے ہونے اور آزادی کی جدوجہد سے ہاتھ کھینچ لینے کا ایک مُنجمد لمحہ ہے!اگر مجھے یہ لمحہ اس لیے عزیز ہے کہ میں اسے پگھلا کر روزمرہ کی یکسانیت آلود دنیا کے متوازی ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہوں،ایک سچے تخلیق کار کی طرح!

☆☆☆

فاصلے

فاصلوں نے زندگی اور کائنات میں کتنی دِل کشی کے ساتھ نظم وضبط قائم کر رکھا ہے!
میں کبھی کبھی سوچتا ہوں زندگی میں موجود فاصلے اگر سمٹ سکڑ کر معدوم ہو جائیں تو زندگی نا قابل برداشت ہو جائے۔ زندگی اپنی فطری مسرتوں کا حق وصول کرنے کے لیے فاصلوں کی محتاج ہے۔ فاصلے زندگی کو ایسے تمام مواقع عطا کرتے ہیں جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ انسان، فطرت اور اپنے ہم مشربوں سے تعلقات استوار کرنے میں فاصلوں کے آئین کی پابندی پر مجبور ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی مجبوری میں زندگی کا سارا لطف ہے۔ فطرت کے کسی دیدہ زیب منظر کا نظارہ کرنے کے لیے ایک خاص فاصلے کو درمیان قائم کرنا ضروری ہوتا ہے جبھی منظر اپنا اصلی حسن ہویدا کر سکتا ہے۔ آپ بہت قریب چلے جائیں گے۔، دوسرے لفظوں میں فاصلے مِٹا ڈالیں گے تو آپ کو وہی منظر بے کیف اور معمولی محسوس ہوگا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں تو یہ بات دراصل فاصلے کی فلاسفی ہی کو بیان کرتی ہے۔ فاصلے دو چیزوں کے مابین ایک ایسے خلا کا استعارہ ہیں جس سے دونوں چیزیں اپنی اپنی ہستی اور انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ چیزوں کی زندگی ان کی انفرادی قوتوں کے بے لاگ اظہار پر منحصر ہے۔ اظہار کی راہوں میں اگر رکاوٹیں سر اٹھاتی رہیں تو چیزوں کی اصلی شخصیت طلوع ہونے میں ناکام رہے۔ فاصلے ان تمام رکاوٹوں کو مٹاتے اور راہوں کو ہموار اور سہل بناتے ہیں۔ جب آپ کسی فطری منظر کے ناظر بنتے ہیں اور اپنے فطرت کے درمیان ایک خاص فاصلہ لگا لیتے ہیں

تو منظر کو اپنی شخصیت کے جملہ خدوخال نمایاں کرنے کا بھرپور موقع میسر آ جاتا ہے۔ یوں فطرت کے حسن سے آپ کسبِ مسرت کرنے کی شرائط پوری کرتے ہیں۔ دوری سہانے پن کو جنم دیتی ہے۔ کسی پہاڑی دوشیزہ کے گانے کی آواز اس وقت کانوں میں رس گھولتی ہے جب سننے والا اتنے فاصلے پر ہو کہ اسے آواز والی کی صورت نظر نہ آ رہی ہو۔ کیوں کہ اگر دوشیزہ نظر آ گئی تو ممکن ہے نظارہ باز آنکھیں سماعت کے دروازے بند کر کے اس کے حسن میں خود بھی کھو جائیں اور ذہن کو بھی لے ڈوبیں اور آواز کو اپنا جادو جگانے کا پورا موقع ہی نہ مل سکے؛ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صورت دیکھتے ہی آواز کا جادو ہی ختم ہو جائے۔

ہمارے حواس بھی تو صحیح طور پر کام کرنے کے لیے فاصلوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی چیز آنکھوں کے بہت قریب آ کر دھندلی ہو جاتی ہے۔ کوئی آواز کانوں سے بہت زیادہ نزدیک ہو تو بے معنی شور کے سوا کچھ نہیں۔ پھول کو آپ ناک کے نتھنوں میں ٹھونس دیں تو خوشبو اتنی بوجھل ہو گی کہ آپ کو سانس لینا دوبھر ہو جائے گا۔ کوئی چیز اُسی وقت اپنے شخصی خدوخال کے ساتھ نکھر کر سامنے آتی ہے جب اسے دیکھنے والی آنکھ ایک خاص فاصلے پر ٹھہری ہوئی ہو۔ جس سماعت بھی آوازوں کی معنویت کا اِدراک کرے گی جب دونوں کے درمیان فاصلے تنا ہو گا۔ باقی حِسیات بھی اپنی صحیح کارکردگی کے لیے فاصلوں ہی کی دَست نگر ہیں۔ فاصلے تعصبات کے لئے سم قاتل کا درجہ رکھتے ہیں، قربت اور نزدیکی کسی شے یا شخصیت کو پوری طرح سمجھنے میں روک بن کر حائل ہو جاتی ہے۔ ہر تاریخی شخصیت اپنے زمانے میں متنازع فیہ ہوتی ہے۔ ایک گروہ اسے دیوتا سمجھتا ہے تو دوسرے گروہ کی نظر میں اسے مجسم شر سمجھ لیا جاتا ہے، مگر جب اُس کا عہد گزر جاتا ہے، زمان و مکاں کا تناظر بدل جاتا ہے، اس کے عہد اور نئے عہد کے درمیان فاصلے کی دیوار بلند ہو جاتی ہے تو متنازع فیہ شخصیت کے حقیقی نقوش نظر آنے لگتے ہیں۔ گویا فاصلے نے نمودار ہو کر اُن تمام تعصبات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جنھوں نے شخصیت کے اصلی رنگوں کی پہچان نہیں ہونے دی تھی۔

فاصلوں کا یہ کردار یک رُخا نہیں۔ فاصلے حسن کا احساس پیدا کرتے اور محبت کے جذبات کو بیدار کرتے ہیں۔ عاشق جب تک اپنی محبوبہ سے فاصلے پر رہتا ہے، آرزوئے وصل سے سرشار رہتا ہے۔ اسے اپنا محبوب ایک ایسی خوبصورت ہستی نظر آتی ہے جو یکتا اور بے مثال ہے

مگر جوں ہی محبوبہ، بیوی کے روپ میں اس کے پاس آجاتی ہے، فاصلوں کے منہا ہو جانے کے باعث اُسے وہ ایک عام سی عورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ گویا وہ پیکرِ حسن کو جب قریب محسوس کرتا ہے تو سارا احساس حُسن کافور ہو جاتا ہے اور جب عاشق جو اَب شوہر نامدار ہے، سوچنے لگتا ہے کہ کیا اِسی کی خاطر میں نے دن کا چین اپنے اُوپر حرام کیا اور راتوں کی نیندیں غارت کیں۔

حسن کسی ظاہری پیکر کا نام نہیں؛ یہ فقط احساس اور کیفیت کا نام ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف اجزاء ایک کُل کی تشکیل میں متناسب طور پر بہم ہوتے ہیں، مگر یہ سب اجزا بھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتے بلکہ اِن سب کے مابین فاصلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اسی سے وہ توازن پیدا ہوتا ہے جو حُسن کا دوسرا نام ہے۔ اس فاصلے میں معمولی سی کمی بیشی بھی ہو جائے تو حسن کا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً موزوں خدوخال کے عین درمیان اگر ناک نارمل جسامت سے زیاد موٹی یا چھوٹی ہو جائے تو چہرے کا سارا حسن غارت ہو جائے گا۔

فاصلے فطرت کی محبوب ترین چیز ہیں۔ فطرت کی ہر چیز میں فاصلوں کی موجودگی ایک امر ناگزیر ہے۔ یہ نظامِ کائنات فاصلوں ہی نے مستحکم بنایا ہے اور فاصلے اس کی بقا و سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہر کہکشاں کے افراد (سیارے) کسی بزرگ ستارے کے گرد ایک خاص فاصلے پر ہی چکر لگاتے ہیں۔ قیامت کیا ہے؟ فقط ان سیاروں کے مابین فاصلوں کی صفیں لپٹنے کا عمل! کہکشاؤں کے ستاروں پر ہی موقوف نہیں، فاصلے ہر ایک شے کے اندرُوں بھی پائے جاتے ہیں۔ ایٹم کتنا معمولی ذرہ ہے، اس میں الیکٹرون نیوکلیس کے گرد فاصلے پر رَہ کر ہی گھومتے ہیں ، اور جب یہ فاصلے ختم کیے جاتے ہیں تو ایٹم نہیں رہتا ایٹم بم بن جاتا ہے، نوعِ انسانی کا سب سے بڑا دُشمن!

شدید قرابت نگاہوں کو دھندلا دیتی ہے اور معروض کی ہستی کھل کر سامنے نہیں آسکتی۔ فاصلہ اس دُھند کے مہین پردے کو پَرے کرتا اور معروض کو کھل کر ظاہر ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ نظریات کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں کسی نظریے کو اپنے اُوپر مسلط کر لیتے ہیں اور اپنے جُملہ اعمال و اقوال میں اس نظریے کو روح کی طرح بسا لیتے ہیں، ایسے لوگوں کی زندگیاں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اشیاء، واقعات اور مظاہر کی حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں بہت سے جھگڑے اور بہت سی جنگیں انسانوں کے اِسی زنگ آلود رویے، فرد

اور نظریے کے مابین فاصلے کی عدم موجودگی ہی کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ان کے برعکس ایک سچا شاعر کامیاب اور بامراد شخص ہے کہ اس کے تصور وفکر پر کسی ایک نظریے یا خیال کی آمریت اور اجارہ داری قائم نہیں ہوتی۔اس کے ہاں خیالات ونظریات کا تنوع ہوتا ہے،دوسرے لفظوں میں شاعر فاصلوں کے شعور سے سرفراز ہوتا ہے۔

ہم اپنے رشتوں میں بھی فاصلوں کے بغیر چل نہیں سکتے۔رشتے اگرچہ فاصلوں کو سمیٹنے اور قربت کا احساس پیدا کرنے کا جذباتی عمل ہوتے ہیں،مگر فاصلوں کو سرے سے پاٹ دینے سے یہ رشتے ٹوٹ پھوٹ بھی سکتے ہیں۔ہم کسی بڑے شخص کے بہت قریب آ کر،اس کی زندگی کی ناہمواریوں سے روشناس ہو کر محسوس کرتے ہیں کہ وہ تو ایک عام سا آدمی ہے۔

فطرت فاصلوں کو برقرار رکھنے پر سدا مائل رہتی ہے۔کائنات کی کوئی سی دو چیزیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر اپنی اپنی شخصی علامتوں سے دستبردار نہیں ہوسکتیں،اور جب اس قسم کی کوشش کی جاتی ہے تو آئینِ فطرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔عشق اور تصوف میں عاشق اور صوفی کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ محبوب سے وَصل کی آرزو میں ہر دَم جلتا رہے مگر جب یہ مراد بر آئے تو اپنی ہستی کو محبوب کی ہستی میں گم ہونے سے بچائے رکھے؛اپنے اوصاف ذات کو ذاتِ محبوب پر تج نہ دے''رانجھا رانجھا کردی نی میں آپ ای رانجھا ہوئی''عشق کا کمال یہ نہیں ہے ۔فطرت نے انسان کو ایک منفرد وجود کے طور پر جنم دیا ہے،اسے اپنا ذاتی تشخص بہر صورت محفوظ رکھنا ہوگا،ورنہ وہ بے نام ونشاں ہوجائے گا۔پروانہ شمع کے سوز میں جل کر راکھ ہوجاتا ہے،اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا،مزہ تو جب ہے کہ شمع کی روشنی سے اس کے اندر بھی چراغ جلنے لگیں۔ پروانے کا عشق بوالہوسی کی ذیل میں آتا ہے اور بوالہوس کی صرف ایک منزل ہوتی ہے۔اس کے برعکس اہلِ دل فاصلوں کے والہ وشیدا ہوتے ہیں اور سدا نامعلوم کی جستجو میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ اہلِ دل کے نزدیک حرکت عین زندگی اور فاصلے کا شعور حقیقی بصیرت ہے۔

فرد اور سوسائٹی کی بقا بھی اسی میں ہے کہ دونوں کے مابین مناسب فاصلہ موجود رہے۔ یہ فاصلہ فرد کی انفرادیت کو مجروح ہونے سے بچائے رکھے گا اور سوسائٹی کے مزاج میں آمرانہ رویہ پیدا نہ ہونے دے گا۔سوسائٹی پیار بھری نظروں سے فرد کو دیکھتی اور اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہے گی،فرد بھی اسی فاصلے کی بنا پر سوسائٹی اور اس کی قدروں کو تحفظ فراہم

کرنے میں سرگرم رہے گا۔ اس طرح فاصلہ فرد اور معاشرے کے کناروں کے درمیان ایک دریا کی طرح بہتا نظر آئے گا۔

قربت سے چیزوں، انسانوں اور نظریوں کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں اور وہ گڈ مڈ ہو کر بے نام اور بے چہرہ ہو جاتے ہیں۔ ایک پارک کا حسن اسی لیے زیادہ فرحت بخش ہے کہ اس میں گنجان جھاڑیوں کے جنگل کے برعکس درختوں کے مابین مناسب فاصلے پیدا کر دیے جاتے ہیں، جن سے ہر درخت اور رَوِش کی انفرادیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان میں ایک پیٹرن اُبھر آتا ہے۔

فطرت بے ذوق نہیں ہے، وہ انسان کو سدا فاصلے پیدا کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے تا کہ وہ زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ فن کی دُنیا میں انسان نے فطرت کی اس دعوت کو ہمیشہ قبول کیا ہے اور تخلیق کے اندر فاصلے پیدا کیے ہیں، جن کو پُر کرنے کی سعی نامشکور ہی سے جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فن کار کا تخلیقی عمل، تخلیق اور اس کے قاری یا ناظر کے مابین مناسب فاصلہ پیدا کرنے کا عمل ہے جس سے دونوں کی شخصیت برقرار رہتی اور مستحکم ہوتی ہے۔

☆☆☆

شہرت کی مخالفت میں

شہرت کا حصول فرہاد کی کوہکنی ہے۔ آدمی شہرت کی جادوئی کشش کا اسیر ہو کر ہر وہ کام کر گزرنے پر کمر ہمت باندھ لیتا ہے جو شہرت کی دیوی کی رضا ہو۔ دیوی شہرت کی ہو، دولت کی ہو یا عشق کی، بڑی حریص اور ریا کار ہوتی ہے۔ جب کوئی اپنی زندگی کے بد بخت ترین لمحے میں اِن دیویوں میں سے کسی ایک کے حسنِ ہوش رُبا سے مسحور ہو جاتا ہے اور یہ بات دیوی کو بھی معلوم ہو جاتی ہے، تو وہ عجب اداؤں اور چالوں کا طولانی سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ دیویوں کی جُملہ ادائیں اور چالیں عاشق کے جذبۂ شوق کو مہمیز لگاتی ہیں۔ دیوی کی ہر تازہ ادا کے ساتھ پجاری کا شوقِ پرستش فراواں ہو جاتا ہے۔ دیویاں عاشق کے کروفر کو ملیا میٹ کر کے اسے ''جاں نثار'' کا اِنفعالی کردار دے دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو پجاری کو دیوی کی محض زیارت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا پڑتی ہے مگر یہ عاشق بھی کتنے سادہ دل اور بھولے (یا شاید احمق) واقع ہوئے ہیں! بھلا اپنی آنکھوں کا نور ختم کر کے کسی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فرہاد بے چارے نے شیریں کی رَضا جوئی کے لیے جوئے شیر لائی (کیا خبر جوئے شیر لانے کا حکم شیریں کے نام سے کسی رَقیب رُوسیاہ نے دیا ہو؟ لیکن یہ رَقیب بھی تو آخر دیوؤں ہی کے ہتھیار ہیں) مگر جب جوئے شیر لا چکا اور سَو طرح کے ارمانوں سے اپنے دل گداختہ کو گرما چکا تو بوجوہ اپنے تیشے سے اپنا ہی سر پھوڑنا پڑا۔ غور سے دیکھیے تو کیا بہت سے لوگ اسی تیشے سے اپنا سَر نہیں پھوڑتے جو شہرت کی جوئے شیر لانے میں کام آتا ہے!

گم نام آدمی کی زندگی بے حد مامون و محفوظ ہوتی ہے۔ وہ نہ رائے عامہ کے قہر کی زد میں ہوتا ہے، نہ کسی دوسرے شخص کے راستے کا پتھر، اس لیے گم نام شخص جملہ انواع کی ٹھوکروں سے اپنے رَختِ جاں کو بچائے رکھتا ہے۔ اس کے برعکس مشہور آدمی زندگی کے ہر لمحے میں خطرات کا محور ہوتا ہے۔ چناں چہ نامور آدمی حتیٰ الوسع کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی بندوں سے دُور کسی ''محفوظ مقام'' پر رہے اور صرف میڈیا کے ذریعے ہی اپنی شخصیت، اپنی ساکھ اور اپنی شہرت برقرار رکھے۔ دراصل غیر معروف اور عام آدمی ریت کے معمولی ذروں کی مانند ہیں جو غیر معمولی اِتحاد اور اِتفاق سے یک جا رَہ سکتے اور محفوظ و مسرور زندگی بسر کر سکتے ہیں، جب کہ مشہور آدمی بلند و بالا مینار کی طرح ہیں، جو ایک بڑے شہر میں بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ یہ بلند و بالا مینار فرض کیے ہوئے ہیں کہ شہر بھر کی عزت و وقار کی جمع پونجی اُن کے ہاتھ میں ہے، وہی اس کے پاسبان ہیں اور وہ یہ حقِ پاسبانی کسی دوسرے کو منتقل کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتے۔ الغرض کوئی ''دوسرا مینار'' یہ حقِ پاسبانی جتھیانے کی جسارت کرتا ہے تو پہلا مینار اپنی عظمت و شہرت بچانے کے لیے شہر بھر کی عزت و وقار کی جمع پونجی بلا تکلف لُٹا دیتا ہے۔

ناموری کا سنگھاسَن ایک نہیں متعدد ستونوں پر کھڑا ہے۔ دولت، عزت، ٹھاٹھ باٹھ، قوت، رعب داب وغیرہ، ایسے ستون ہیں جو ناموری کے زمرد جڑاؤ تخت کو اپنے سَروں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان ستونوں کی تیاری ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ سینکڑوں اشخاص کا خون پسینا اور ہڈیاں صَرف کرنا پڑتی ہیں۔ تب کہیں اَہرامِ مصر یا تاج محل بنتے ہیں مگر شہرت صرف ایک شخص کو میسر آتی ہے۔ وہ تمام چہرے اور قوتیں پَس منظر میں ڈوب جاتی ہیں جو ناموری کے سنگھاسَن کی تعمیر میں کام آئی تھیں۔ یوں دیکھیے تو شہرت دوسرے انسانوں کے اِستحصال کے بغیر ممکن الحصول نہیں ٹھہرتی۔

ہر انسان مخصوص اور محدود قوتوں کا حامل ہے۔ مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرنے کے لیے اپنی محدود صلاحیتوں کی موجودگی کو کھلے دل سے قبول کرنا ضروری ہے۔ مسرت زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ انسان نے زندگی کے وحشیانہ پیرائے سے مہذب طرزِ زندگی اپنانے تک اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ مسرت حاصل کرنے کے اَن گنت پیرائے ہیں۔ جنس، انتقام، تخلیقِ فن اور شہرت۔ یہ سب مسرت کی گریز پا کیفیات کو گرفت میں لانے کے ذرائع ہیں

۔تاہم یہ ذرائع جمہوری طرزِ حکومت کے ووٹ نہیں جن کو صرف گِنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا۔ مسرت بخش ذرائع یکساں ذائقے اور خوشبو سے مملو خوشی بہم نہیں پہنچاتے۔ مثلاً جو مسرت تخلیقِ فن سے حاصل ہوتی ہے وہ جنسی زندگی اور شہرت میں ممکن نہیں۔ شہرت کا بھوت آدمی کو لامحدود قوتوں کا علمبردار ہونے کا خبط دیتا ہے، اور آدمی محدود صلاحیتوں کی دسترس میں سرچشمہ ہائے مسرت سے نظریں پھیر کر محض وہم گمان کی مسرتوں کا جویا رہتا ہے۔ وہ جھونپڑے میں بیٹھا ہے مگر شہرت کا بھوت اسے محلوں کے خواب دکھاتا ہے۔ خواب دیکھنا بجائے خود کوئی برا نہیں لیکن ایسے خواب جو ''حال'' اور ''موجود'' کی نفی کا سبق سکھائیں، صحت منداور نارمل زندگی کے حق میں برے ثابت ہوتے ہیں۔ آدمی جھونپڑے کی مٹی کی بوباس کو محسوس کرنے، اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو کے درمیان رشتے دریافت کرنے کے تخلیقی عمل سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ بے نیازی غیر فطری ہے، اس لیے نتیجتاً آدمی خوابوں کی شکست وریخت پر کُوھتا رَہتا ہے۔

ناموری کا حصول بڑی حد تک غیر فطری عمل ہے۔ یہ بالعموم لالۂ خودرَو کی طرح آدمی کی شخصیت سے نہیں پھوٹتی بلکہ یہ تو ایسا کاغذی پھول ہے جس کی تیاری میں آدمی کو اپنا اور جتنا ہو سکے، دوسروں کا خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی بعض حساس لوگوں کو اِن پھولوں سے خون کی بو بھی محسوس ہو جاتی ہے اور خون کی بو کسی وحشی کو ہی بھلی لگتی ہوگی! نیز یہ پھول دیرپا بھی ثابت نہیں ہوتے۔ ایک زمانے میں بعض شخصیات کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔ ایک قوم اُن کے نام لے کر جیتی اور دوسری قوموں میں سَر بلند ٹھہرتی ہے۔ مگر اگلے ہی زمانے میں نیا شعور اُن شخصیتوں کے اَہرامِ شہرت کو پیوندِ خاک کر دیتا ہے اور پھر وہی قوم اُن کا نام لیتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتی ہے۔ شاید شہرت سفید ہاتھی ہے جسے زندہ اور توانا رکھنے کے لیے بیش بہا قوت درکار ہے۔ کتنے ہی سیاستدان اور شوبزنس کے لوگ اپنی ناموری کا بھرم رکھنے کے لیے کتنا کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں، اپنا اور حسبِ توفیق دوسروں کا!

غیر معروف آدمی ہوا کے سُبک جھونکے کی مانند آزاد ہے، جب کہ مشہور آدمی اپنی شخصی آزادی کو شہرت کی دیوی کے حضور بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ زندگی کی کتنی ہی بیش بہا مسرتیں شخصی آزادی کی مرہونِ منت ہیں۔ مثلاً اگر آپ خوش قسمتی سے بالکل گم نام سے شخص ہیں تو سیر و سیاحت کا خوب لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فطرت کے حسین مناظر کو دیکھ کر آپ اپنے فوری اور

فطری رَدِعمل کا مظاہرہ کرنے میں آزاد ہیں۔ بے چارہ مشہور آدمی ایک تو کہیں اکیلا آ جا نہیں سکتا، ایک ہجوم اُس کے پہلو میں اور تعاقب میں ہوتا ہے۔ دوسرا وہ اپنے کسی بھی احساس اور خیال کے اظہار میں اس ہجوم کی نافذ کردہ اخلاقیات کا پابند ہے۔ بالفرض وہ اس پابندی سے سَرکشی کی ذرا سی کوشش کرتا ہے تو اس کی عزت وشہرت کے سَر بازار نیلام ہونے کا قوی خطرہ ہے۔

مشہور لوگوں کا اپنی ذات سے رشتہ تقریباً ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے نہیں، پرائے ہو چکے ہوتے ہیں۔ شہرت فی الاصل پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب آدمی اپنی 'خَلوت' کو خیر باد کہہ کے ''انجمن'' میں آتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی خَلوت کو ہی انجمن میں بدل لیتے ہیں، مگر اِس عمل کا ثمر شہرت کی صورت میں سامنے نہیں آتا، کیونکہ خَلوت کو انجمن کی شکل دینا خلوت کی ہی توسیع ہے۔ خلوتِ ذات ایک اَسرار ہے، جسے آدمی جتنا محسوس کرتا ہے، یہ اُتنا ہی بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ذات کا یہ پھیلاؤ ساون کے بادلوں کے مماثل نہیں کہ برسیں نہ برسیں، اپنی گرج سے سب کو باخبر ضرور کرتے ہیں۔ البتہ شہرت ساون کے چنگھاڑتے بادلوں کا استعارہ قرار دی جاسکتی ہے، جو 'بزمِ مے' سجانے میں شاعرانہ شہرت رکھتے ہیں۔ نامور لوگ انجمنوں، محافل اور تقریبات کے والہ وشیدا ہوتے ہیں، گھر سے باہر قدم رکھتے ہی کوئی نہ کوئی تقریب ان کے استقبال میں سَراپا انتظار ہوتی ہے۔ یہ تقریب تو کچھ دیر کی مہمان ہوتی ہے مگر مشہور آدمی کی شرکت تقریب کو دستیاب ذرائع ابلاغ کے ذریعے چہار سُو پھیلاتی ہے۔ مشہور آدمی اپنی زندگی اور بعد اَز موت بھی سچی انسانی ہمدردی سے محروم رہتا ہے۔ سماج مشہور آدمی کو اپنے ''سِفارتی مقاصد'' کے لیے استعمال کرتا ہے۔ زندگی میں اسے ''لابی اِسٹ'' کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اسے مجسمے یا تصویروں کی شکل میں میوزیم میں سَجا دیا جاتا ہے تا کہ کلچر کے نمائندے کا کام دے سکے۔

☆☆☆

میرا ننھا اُستاد

اِن دنوں میں نے اپنے دو سالہ بیٹے کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوا ہے۔ یہ ننھا فرشتہ جب سے ہمارے گھر میں آیا ہے، میرے تو دن بدل گئے ہیں۔ میں اپنے زعم میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے زندگی میں اِتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ بقیہ زندگی ان اصولوں کی پاسداری میں مزے سے گزر جائے گی، مگر میرے بچے نے میرے زعم کی پختہ اور شاندار عمارت کو زمیں بوس کر دیا ہے۔ اصل میں میرے ذہن میں یہ خیال نقشِ آہن کی طرح ثبت ہو گیا تھا کہ صرف بڑے اور بزرگ قسم کے لوگوں ہی سے سیکھا جاتا ہے۔ علم اور دانائی کے گل زریں تک پہنچنا صرف اُن لوگوں کا مقدر ہے جن کے چراغ عمر کی لَو کنارِ سحر کو مَس کرنے کے قریب ہو۔ مگر میرے بیٹے نے مجھے باور کرایا ہے کہ علم تو زندگی ہے، دھڑکتی، تھرکتی، بے داغ زندگی! ننھے کی صورت میں زندگی اپنی خالص ترین شکل میں مجھے دکھائی دی ہے، بے سِلوٹ، بے لَوث اور بے داغ! پہاڑی جَھرنے کی طرح ہر آلودگی سے پاک اور اپنا رَستہ اپنی باطنی قوت سے بناتی ہوئی اور اس عمل میں ایک ملکوتی سُر بکھیرتی ہوئی۔

میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا ہوں۔ آس پاس کتابیں، کاغذ اور قلم بکھرے پڑے ہیں۔ ننھا مجھے بے لفظ آواز میں اپنی آمد سے مطلع کرتا ہے۔ پہلے پہل تو میں اس کی آمد کو مداخلتِ بے جا تصور کرتا تھا۔ فوراً اسے اس کی ماں کی گود میں پہنچاتا اور پھر لوٹ کر اپنے سلسلہ قرأت کو شروع کرتا، مگر اس دوران توجہ کا رَہٹ رُک چکا ہوتا اور میری کوشش کے باوجود اِرتکاز کی پہلی

کیفیت بحال نہ ہو پاتی۔ میں غصہ اور جھنجھلاہٹ محسوس کرتا۔ مگر پھر ایک دن مجھے معاً احساس ہوا کہ ننھا تو مجھے وہ کچھ سمجھانے آتا ہے، جو میں اتنی موٹی موٹی کتابوں اور بزرگ لوگوں کے اُپدیشوں سے نہیں سمجھ پایا۔ ننھا میرے ہاتھ سے کتاب لے کر اپنی پوترتوتلی آواز میں بتاتا ہے کہ اس قدر سنجیدگی چہ معنی دارد؟ یہ علم نہیں سَراسَر پوجا ہے۔ اپنی ذات کو بُت بنا کر اس کے آگے سیس نوانا اظہارِ پرستش ہے، وہ علم ہی کیا جو آدمی کو آدمی سے گفتگو سے باز رکھے۔ علم تو زندگی کے جزیروں کی سیاحت کرنا اور مسرت حاصل کرنا ہے، نہ کہ ایک ہی جزیرے میں پابند ہو کر رہ جانا۔ قطرے میں دَجلے کا نظارہ کرنا بھی معرفت کی کوئی صورت ہوگی مگر فطرت نے جو رنگا رنگ ''قطرے'' پیدا کیے ہیں تو اس میں بھی کوئی رَمز اور حکمت تو ہے! انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کنویں کے بیل کی طرح آنکھیں میچے ایک ہی مرکز کا طواف کیے جاتے ہیں اور یہ مرکز اپنی ذات ہے۔ انسان خون اپنے آپ سے یوں چپکا ہوا ہے جیسے کانٹوں بھری خشک جھاڑی سے کوئی کپڑا اُلجھا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ ہر لحظہ اس خوف میں گرفتار ہے کہ اگر اس نے خود سے الگ ہو کر کسی دوسری شے سے وابستہ ہونے کی کوشش کی تو اس کا دامنِ ہستی لیر لیر ہو جائے گا۔

اب میں رَفتہ رفتہ اپنے ننھے استاد کی بے حرف صدا کے مفاہیم سمجھنے کے قابل ہوتا جا رہا ہوں اور مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ معانی صرف اَوروں کے وضع کردہ لفظوں ہی میں مقید نہیں ہوتے۔ ایک تازہ دَم پیکرِ زندگی کی ہر سَرسَراہٹ معانی سے لبریز ہے، بس حسنِ سماعت ہونا چاہیے۔ ابھی میرا یہ استاد کسی کا شاگرد نہیں ہے، مگر میرے لیے یہ سخت افسوس کی بات ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ ننھا فرشتہ آدمیوں میں رہتے ہوئے اُنھی کی زبان بولنا شروع کر دے گا، اور اسے زبان کی راہ سے آس پاس کے لوگوں کے سارے تعصّبات اور مخصوص تصورات بھی منتقل ہو جائیں گے۔ وہ زندگی کو خود اپنی نظر سے دیکھنے کے بجائے دوسروں کی دیکھی ہوئی زندگی کو خود اُنھی کے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی مشقت اٹھائے گا۔ میرا یہ ننھا استاد چیزوں کو ان ناموں سے پکارنے سے انکاری ہے، جو ہم نے چیزوں کو دے رکھے ہیں۔ نام اگر صرف چیزوں کی طرف اشارہ کرنے تک محدود ہوتے تو خیر تھی، ہم نے تو ناموں کے ساتھ معانی اور تصورات بھی باندھ رکھے ہیں، جو اُن اشیاء کو اچھی اور بُری میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی شے کا نام سنتے ہی ہمارے اندر خوشی یا

ناگواری کے جذبات فوراً بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہم ناموں کے ساتھ بچوں کو یہ تصورات اور جذبات بھی منتقل کر دیتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ ہمارا یہ عمل معصوم زندگی کے فطری بہاؤ میں ایک رکاوٹ ہے! ننھا چوں کہ ہمارے وضع کردہ ناموں سے اشیا کو نہیں پہچانتا، اس لیے اس کا سب اشیاء رشتہ بالکل مختلف قسم کا ہے۔ اس نے کسی شے کو اچھی یا بُری، نفع بخش یا غیر ضروری، قابلِ محبت یا قابلِ نفرت کے خانوں میں نہیں بانٹا ہوا۔ وہ سب چیزوں کی طرف یکساں دلچسپی سے لپکتا ہے۔ اس کی نظر میں مٹی کے کھلونے یا قیمتی الیکٹرانک کھلونے میں ذرا فرق نہیں۔ اسی طرح اس کے نزدیک ایک ہزار کا نوٹ اور ایک رَدی کے کاغذ کا ٹکڑا برابر قیمت رکھتے ہیں۔ پس اس کی دنیا میں حاصِل ہی حاصِل ہے، لاحاصلی اور محرومی کا کوئی مدھم نِشان تک نہیں۔

ننھا اکثر میری میز پر بجی سنوری اور مرتب کتابوں کو یوں اُلٹ پلٹ دیتا ہے کہ میرے ذہن میں پانی پَت کی جنگ کا نقشہ آ جاتا ہے۔ اس عمل سے ننھا مجھے یہ باور کراتا ہے کہ ڈیئر فادر، اس قدر نظم وضبط ایک بوجھ ہے، جبر ہے اور اصل میں خوف کا نتیجہ ہے! اور واقعی مجھے یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اگر میں نے کتابوں کو ترتیب سے نہ رکھا تو عین وقت پر کسی اہم کتاب کو تلاش نہ کر سکوں گا، حالانکہ عین وقت پر کوئی اہم ترین چیز دستیاب نہ بھی ہو تو کوئی قیامت نہیں آ جاتی، اور میں دیکھتا ہوں کہ ننھے نے اپنے کھلونوں کو بھی ترتیب سے کسی خاص جگہ پر کبھی نہیں رکھا، بلکہ وہ تو کھلونوں سے بھی بے نیاز ہے۔ وہ کھیلنے کے لیے کسی شے کو بھی بطور کھلونا استعمال کر سکتا ہے، میرے قلم سے لے کر گھر کے قیمتی برتنوں تک کو!

ایسا نہیں کہ میرا ننھا استاد سارا دن ہی مجھے اپنی شاگردی کا شرف بخشتا ہو۔ اس کا زیادہ وقت کھیلنے میں گزرتا ہے۔ پلاسٹک کے کھلونوں سے لے کر گھر کی سب اشیا کے ساتھ! اس کی نظر میں ایک مٹی کی گڑیا اور آر کو پال کے کپ میں کوئی امتیاز نہیں۔ ہمارے اکثر دکھوں کا باعث یہ ہے کہ ہم نے مختلف چیزوں کی قیمتیں مقرر کر رکھی ہیں اور اپنی خوشیوں اور محرومیوں کو ان قیمتوں سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ میرے بیٹے نے مجھے سمجھایا ہے کہ زندگی اپنی خالص صورت اور بنیادی بے لوث سطح پر چیزوں پر قیمتوں کے لیبل نہیں لگاتی۔ مجھے میرا استاد تصوف کی اس منزل پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے جہاں ستارے اور پرِ کاہ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ کبھی ایک بنیادی اور اَزلی اَسرار کی لَے میں مست نظر آتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، صوفی اور رشی مُنی اس منزل تک پہنچنے کے لیے برسوں کنویں

میں اُلٹا لٹکتے ،جنگلوں میں مارے مارے پھرتے یا آنکھیں بند کر کے کسی گھنے پیڑ کے نیچے دَم سادھے بیٹھتے ہیں: کہیں یہ ساری ریاضت اور مشقت الٹے قدموں چل کر بچپن کی بے لوث اور "بے رنگ" معصومیت کے اِحیا کے لیے تو نہیں!..........تاہم میرا یہ ننھا استاد صوفیوں کی طرح دنیا اور زندگی کو لغو اور شر قرار نہیں دیتا۔ وہ کھیل تماشے کا شیدا ہے اور اسی سے خوشی کشید کرتا ہے۔ وہ کسی پَل چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس کے لیے خوشی زندگی کو بھرپور اور متحرک طریقے سے گزارنے میں پوشیدہ ہے۔ ننھے کی شاگردی میں رہتے ہوئے مجھے وہ لمحہ مل گیا ہے جو زندگی کی ہماہمی میں برسوں قبل مجھ سے کہیں بچھڑ گیا تھا......حال کا لمحہ، جس میں میرا استاد رہتا ہے!

بظاہر ننھے کی زندگی منتشر ہے۔ وہ ہر پل اپنی دلچسپیاں بدل لیتا ہے۔ ابھی وہ ایک کھلونے کی طرف کسی جان ہار عاشق کی طرح بڑھتا ہے تو دوسرے ہی پَل وہ اُسے کاٹھ کباڑ سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔ وہ کسی ایک شے سے وابستہ ہونا نہیں چاہتا۔ دلچسپی اور وابستگی تو اس کے خون میں شامل ہے، مگر اس کے مراکز بدلتے رہتے ہیں۔ اب میں غور کرتا ہوں تو مجھے وابستگی کے معانی بھی پوری طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ انسان میں اکتاہٹ، بیزاری اور گریز کے جذبات بھی اُتنے ہی شدید ہیں، جتنے محبت، دلچسپی اور وابستگی کے! یا شاید دونوں طرح کے جذبات ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اگر اِس سکے کا ایک ہی رُخ سدا سامنے رہے تو دوسرا رُخ زنگ پکڑے گا اور پورے سکے کو کھوٹا کر دے گا۔ بچے میں اپنی ذات کی نشوونما کا ایک خودکار نِظام ہوتا ہے، اس لیے وہ سکے کے دونوں رُخوں کو باری باری سامنے لاتا رہتا ہے۔ مگر ہم یک رُخے لوگ صرف وابستگی اور محبت کے رُخ کو بچے کی شخصیت پر حاوی دیکھنا چاہتے ہیں، یوں اس کی فطری نشوونما میں مُزاحم ہوتے ہیں یا شاید ہم اسے اپنی طرح بنانے کا سودا سَر میں رکھتے ہیں۔

میرے ننھے استاد نے سب سے بڑا کمال یہ ہے کیا ہے کہ میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مسائل، الجھنوں اور روزمرہ کی مشینی زندگی نے مجھ سے "نظر" چھین لی تھی، میں دیکھتا تو تھا مگر میرے دیکھنے میں بالکل سامنے کا منظر شامل نہیں ہوتا تھا بلکہ میں نے منظر کی دِید سے دراصل اپنے پرانے پختہ خیالات اور تعصبات کی تجدید کرتا تھا۔ اس طرح میں چیزوں سے ہمیشہ ایک بڑے فاصلے پر رہا ہوں۔ چیزوں کے ساتھ میرا رشتہ زندگی کی سطح پر قائم نہیں رہا تھا..........مگر میں نے دیکھا ہے، میرا یہ ننھا استاد کسی بھی صدمے یا ناخوشگوار واقعے کے اثرات کو اپنی روح کا داغ اور

بدن کا کوڑھ بننے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسے اپنے اِرد گرد کاہ سے لے کر ستارے تک ہر شے میں اتنا حسن اور کشش دکھائی دیتی ہے کہ وہ صرف ایک شے کے کھونے کے ملال میں گرفتار رہنا بالکل پسند نہیں کرتا۔ بظاہر وہ ایک دل پھینک عاشق ہے مگر اصلاً وہ زندگی کے سب مظاہر سے بلا امتیاز بے انتہا پیار کرنے والا ''ہیومن اِسٹ'' ہے۔ بچہ بڑوں کی اس غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا کہ فطرت سے کٹ کر صرف کلچر کا ہو کر رہ جائے۔ بچہ فطرت اور کلچر کی تقسیم کا قائل نہیں۔ وہ جتنا پرندوں، جانوروں اور اُن سے ملتے جلتے کھلونوں کی صحبت میں ایک بھرپور، حقیقی خوشی محسوس کرتا ہے، ویسی ہی خوشی وہ اپنے ہم عمر، جواں اور بزرگ دوستوں کے ساتھ اُن کھیلوں میں پاتا ہے جو صرف بچپن کی سائیکی میں محفوظ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر بڑی نسل کو، جو کلچر کی یعنی خمارِ رُسوم و قیود کی ہو کر رہ جاتی ہے، بچے کی فطرت سے سیکھنے کی بہت کچھ ضرورت ہے۔

خواہش

میرے کئی دوست سگریٹ پینے کے عادی ہیں۔ اکثر ایک ہی وضع کے برانڈ پر مرمٹے ہیں۔ وہ برانڈ کی تبدیلی سے یوں پڑ کتے ہیں جیسے وہ کسی لنگوٹیے یار سے بے وفائی کر بیٹھیں گے۔ مجھے ان کی استقامت سے بہت انسپریشن ملتی ہے۔ یہ استقامت مزاج یا تو کلاسیکی شعرا میں ملتی ہے جو جس جا بیٹھتے تھے ئے خانہ ہو جاتا تھا، یا پھر قوالوں کے ہاں جو ایک ایک مصرع کو اتنا بلوتے ہیں کہ ایک ایک حرف میں معانی لشکارا مارنے لگتے ہیں۔ مگر میرے دوست ''ا'' کو روز سگریٹ کے برانڈ بدلنے کا لپکا ہے۔ دنیا میں شاید وہ واحد آدمی ہیں جو باقاعدہ ایک نقطۂ نظر کے تحت سگریٹ نوشی کرتے ہیں اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان اگر اپنی حسیات کو فقط ایک آدھ ''ذائقے'' تک محدود کر لے تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔ کان اس لیے نہیں بنے کہ بیوی کی تکرار آلود باتیں، کسی موسیقار کا گایا پکا راگ، کسی مشاعرہ باز شاعر کی مقبول غزل یا ٹی وی کا خبر نامہ سنا جائے۔ ان سے تتلیوں کے ہوا میں تیرنے سے تخلیق پانے والی ''بے صدا آواز'' ایک بچے کی کھنکھناتی ہنسی اور اگر خدا توفیق دے تو ''صریرِ خامہ'' میں ''نوائے سروش'' کو بھی سنا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زبان بھی صرف دال روٹی سے بامزہ ہونے کے لیے نہیں۔ اس کی نوک سے آپ قدرت اور انسان کے بنائے ہوئے بے حساب ذائقوں کو ''دانہ دانہ'' شمار کر سکتے ہیں۔ ان کا مؤقف ہے کہ وہ برانڈ اِس لیے بدلتے ہیں کہ قدرت کی ایک ہی نوع (یعنی تمباکو) میں قسم قسم کے ذائقوں کو اپنی زبان لذت شناس پر منکشف اور مُرتسم کر سکیں۔ شاید ایسا کرنے سے کم سے کم زبان تو شکر گزار بن جائے۔

میں اپنے دوست کے اس نقطۂ نظر کی تہ میں خواہش کی کروٹوں کو کارفرما دیکھتا ہوں۔ خواہش مشرقی عورت کے مثل ہے، جو اپنے چھپنے کے اسلوب ہی میں عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ خواہش ننگے بدن تو کیا کبھی ننگے پیر اور ننگے سَر بھی اپنے مسکن سے باہر نہیں نکلتی۔ وہ اپنی شناخت کو ہزار پردوں اور پیرایوں میں مستور رکھنے کی عادی ہے۔ خواہش کیوپڈ کی طرح کبھی پسند نہیں کرتی کہ اُسے اُس کے نزول رُوپ میں دیکھا جائے۔ یوں دیکھیں تو خود خواہش کے ''دل ''میں ہزاروں ''خواہشیں'' ہیں اور ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکل سکتا ہے، اور واقعی کچھ خواہشیں دیار دل کی سرحد کو، پہریداروں کو جُل دے کر پار کرلیں تو ایک جنگ ہی تو شروع ہو جائے، خواہش اور معاشرتی روایتوں اور قدروں کے رکھوالوں کے مابین۔ اسی لیے اِن رکھوالوں نے جگہ جگہ خواہش کی بغاوت کے انسداد کے لیے ایمرجنسی سنٹر اور ادارے قائم کر رکھے ہیں، مگر خواہش کی خوش قسمتی ہے کہ وہ بہروپ بھر کر دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونک سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خواہش لاوارث ہو کر کسی بندی خانے میں آج گل سڑ رہی ہوتی!

بہروپ بھرنا خواہش کی نہ مجبوری ہے نہ خود حفاظتی اقدام! خواہش خود کو منقلب کرنے کی صلاحیت کا ادنیٰ اِظہار بہروپ بھرنے کی صورت میں کرتی ہے۔ اب یہ آدمی پر منحصر ہے کہ وہ خود کو خواہش کے اس ادنیٰ اظہار کا آلۂ کار بنائے یا اپنی ذات کا ترفع کرے۔

خواہش حقیقت میں ایک اندھی قوت ہے جو لازماً عمل آرار رہنا پسند کرتی ہے۔ ہر چند یہ اپنے بہاؤ میں رائی سے لے کر پہاڑ تک سے ٹکرا جانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی۔ تاہم یہ اپنی ساری شکتی راہ میں حائل کوہِ گراں پر دَھاڑنے یا اُسے ہٹانے میں خرچ کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتی۔ اسے اپنی قوت کی عظمت اور تقدیس کا اِس قدر خیال ہے کہ وہ اس کے رَتی بھر زیاں کو گوارہ نہیں کرتی۔ یوں بھی وہ راستے بدل بدل کر اپنے ذوقِ تماشا کی تسکین نیز اپنی عزیموں کی آزمائش خود اپنے ہاتھوں کرنے کی خُوگر ہے۔

اس فنا پذیر دُنیا میں خواہش کو یہ اِمتیاز حاصل ہے کہ اسے موت کے ٹھنڈے یخ ہاتھ نہیں چھو سکتے۔ اگرچہ کبھی کبھی لگتا ضرور ہے کہ مرگِ آرزو کا وقوعہ ہو گیا ہے، خواہش سیر ہو گئی ہے مگر یہ ماندگی کا وہ وقفہ ہے جو سانس کی ''آمد وشد'' نبض کی دو دھڑکنوں اور دو لمحوں کے درمیان ہوتا ہے جو اساساً تخلیقِ تازہ کی بے نشاں سی کیفیت ہے اور جو زندگی اور خواہش کی بقائے دوام کی ضامن

بھی ہے۔اسی بے نشاں کیفیت میں خواہش کچھ دیر کے لیے بے دَم ہو کر نئی آرزو اور نئے ارمان کا بیج خلق کرتی ہے۔زندگی کی کھیتی میں اگر ایسے بیجوں کی آمد خدانخواستہ رُک جائے تو جینا کتنا بے رَس، بے ذائقہ ہو جائے۔

ایسا نہیں ہے کہ سب ہی خواہش کی خیر خواہی چاہتے ہیں۔اس کے دشمن بھی بہت ہیں اور کچھ تو اس کے جانی دشمن ہیں جو ہمہ وقت لٹھ لے کر اس کے تعاقب میں بے حال ہیں مگر نہیں جانتے کہ خواہش کو مارنا تو کسی طور ممکن نہیں۔خواہش کہیں باہر نہیں، خون میں، رگوں میں اور اِردگرد کے اِدراک میں رَواں دَواں ہے۔سماج سُدھار کے نام لیواؤں کو، جنھیں دنیا میں سارے فساد کی جڑ خواہش دِکھتی ہے،........... پہلے خواہش کو مارنے کی اَندھی خواہش کا سر قلم کرنا ہوگا مگر کون ہے جو اپنے اُوپر پہلا پتھر آپ پھینکنے کی جرأت کرے۔

یوں دیکھا جائے تو خواہش خود اپنے مخالف پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔شاید اس لیے کہ اس طرح ایک تو اسے اپنی قوتوں کو جگائے رکھنے اور آزماتے رہنے کا موقع ملتا رہے گا اور دوسرا کچھ کھیل تماشا جاری رہے گا۔تاہم بات صرف اتنی نہیں ہے خواہش ہر ''ٹکراؤ'' میں خود اپنی توسیع اور تقلیب کرتی ہے تا کہ نفیس اور اَرفع مسرتوں کی ایورسٹ کو سَر کر سکے۔مہاتما بُدھ نے جب انسانی دکھوں کی جڑ میں خواہش کو نشان زَد کیا تھا اور انسانی مسرتوں کا راز اِس جڑ کو کاٹ ڈالنے میں دیکھا تو اصلاً وہ تمام انسانوں کے لیے سچی اور کھری مسرتوں کی ہی خواہش کر رہا تھا اور یہ خواہش کی انتہائی اِرتقا یافتہ صورت تھی!

☆☆☆

موت

موت خوشبو کی طرح دَست وپا کی گرفت میں نہیں آتی، مگر اپنے وجود سے زندگی کو اُتھل پُتھل رکھتی ہے۔ زندگی کو وَہم ہے کہ موت اس کے تعاقب میں کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح لگی ہوئی ہے اور موقع پاتے ہی اس کے قیمتی رازوں پر ہاتھ صاف کر جائے گی۔ حالاں کہ موت کی مملکت وہی ہے جو زندگی کی ہے!......موت اور زندگی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، اور کوئی نادیدہ پراسرار ہاتھ اس سکے کو ہوا میں اُچھال رہا ہے، کبھی زندگی کا رخ اُوپر آتا ہے اور کبھی موت کا۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس پراسرار ہاتھ کے کمال سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیوں کہ ہم سب ''سکے'' ہیں۔ کبھی ہم خود اُلٹائے پلٹائے جا رہے ہوتے ہیں اور کبھی ہمارے بھائی بند۔ اور یہ کھیل ہر لحظہ جاری ہے، اس لیے ہم اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر چیخنے اور رونے پیٹنے سے فارغ ہی نہیں ہو پاتے۔

زندگی موت کو اپنا جانی دشمن سمجھتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ موت ریاکار ہے، یہ چھپ کر وار کرتی اور اُس کے عمر بھر کے منصوبوں کو کچے گھروندوں کی طرح مسمار کر ڈالتی ہے۔ زندگی موت کے سوا ہر شے کو اس کے قدموں کی آہٹ سے پہچان لیتی ہے۔ سو اُن کی طرف سے وہ مطمئن ہے، مگر موت اسے ہر گھڑی اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار رکھتی ہے۔ اگر زندگی کا بس چلے تو اپنا سارا دَھن موت کے چرنوں میں ڈھیر کر دے اور موت سے دوستانہ مراسم قائم کر لے۔ مگر زندگی نہیں جانتی کہ موت کے صرف دَرشن کرنے کے لئے تن اور من کی بھینٹ دینا پڑتی ہے، یارانہ تو

دُور کی بات ہے!

زندگی لاکھ موت سے مخاصمت رکھے، موت زندگی سے دیرینہ رفیق کا سلوک کرتی ہے۔ زندگی نفرت یا خوف کی وجہ سے موت کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتی، مگر موت ہمیشہ زندگی کی راہوں میں آنکھیں بچھائے ہوتی ہے۔ موت نے زندگی کے دل سے خوف کا کانٹا نکالنے کے لیے لاکھوں جتن کیے ہیں مگر زندگی ہمیشہ موت کی طرف سے بدگمان ہی رہی ہے اور موت کی خوش اخلاقی کو شک اور حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی اپنی ہی پرستش میں مبتلا ہے اور اپنی ذات کے گُنبد بے در سے باہر جھانکتے ہوئے تھرتھرانے لگتی ہے...... زندگی جوں ہی اپنی پوجا کے حِصار سے نکلی ہے، دَوڑ کر موت کی نرم لچکیلی باہوں میں جھول گئی ہے اور وہ سارے سُکھ پا گئی ہے، جن کی حسرت اُسے تاحیات رہی۔

۔ دنیا کے تمام بڑے شاعر، سائنس دان اور فلسفی جب مَوت کو اپنے لہو میں رینگتے محسوس کرتے ہیں تو اپنے جواہر کو اپنے ہی وُجود کی کھیتی میں بو دیتے ہیں، اور جب ان کے فن و فکر کی فصل پک کر تیار ہوتی اور ایک عالم جھولی پھیلائے منتظر ہوتا ہے تو وہ موت کی جزوی شکست کا اعلان کر دیتے ہیں، مگر انہوں نے شاید موت کا کہا گیا حرف ستائش نہیں سنا ہوتا۔ اس سے زندگی سے وہ سرگوشی میں کہہ رہی ہوتی ہے، بی بی، تجھے کیا پتہ! میں ہی تیری اَصل شکتی ہوں۔ میں نہ ہوتی تو تُو جنگلوں میں برہنہ ماری پھر رہی ہوتی اور شاید بالکل تنہا ہوتی۔ مجھے دعائیں دے، میں نے تیری نسل بڑھائی ہے، تیری تنہائی آباد کی ہے اور کائنات میں حُسن اور تنوع پیدا کیا ہے!

موت زندگی کو خود سے پیار کرنے پر ملامت نہیں کرتی، البتہ اسے پروانے کے بجائے بھونرا بننے کی پٹی ضرور پڑھاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ پروانہ ایک ہی شے کو اپنا واحد محبوب قرار دے کر پہلی ملاقات میں اپنی جان اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ جب کہ بھونرے کے دل میں ہزاروں صورتوں کے لیے تڑپ ہوتی ہے۔ اس میں زندگی کرنے اور زندگی جینے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ پروانے کا دل دریافت کے جذبے سے تہی ہوتا ہے جب کہ بھونرے کا دل جستجو کی تڑپ سے آباد ہوتا ہے   یوں موت فی الاصل زندگی کو ہست کی گوناگوں لذتوں اور نو بہ نو دریافتوں سے حظ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے........ موت زندگی کے تخلیقی تحرک کے ضامن ہے۔

چراغ آفریدم

ذرا خیال کیجئے! اگر موت نہ ہوتی تو یہ سیارہ کتنا بے رَونق اور یکسانیت وفرسودگی میں اٹا
ہوتا! موت زندگی کے آئینے پر سے کہنگی کی گرد ہٹاتی ہے تاکہ زندگی زاویے بدل بدل کر انوکھے
مناظر کا لطف لیتی رہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی ہر بار ہَٹ دَھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی جگہ
بدلنے سے انکار کردیتی ہے، ایسے لمحوں میں موت کو سفاکی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، مگر سوچنے کی
بات یہ ہے کہ زندگی جب اپنے ہی بوجھ تلے بلبلاتی ہے تو بھلا کس کو مدد کے لیے پکارتی ہے
؟زندگی کی دکھ بھری پکار کا جواب اگر موت بھی نہ دے تو کیا ہو!

کتنا قریب کتنا دور!

دوسرا دن ہے، میں اپنے کمرے میں بند ہوں۔ یوں تو کمرے میں تادیر رہنے سے مجھے خواہ مخواہ اپنے قیدی ہونے کا گمان ہو رہا ہے، لیکن باہر کے حالات ایسے ہیں کہ نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ باہر دو روز سے جاری مسلسل بارش اور ٹھنڈ نے کرفیو سا نافذ کر رکھا ہے اور میری چھتری ایک دوست لے گیا ہے، ورنہ میں کرفیو کی پابندی توڑنے کا لطف ضرور اٹھاتا۔

میں کالج کے ایک بڑے گیسٹ ہاؤس میں تنہا رہتا ہوں اور طبعاً زیادہ سوشل بھی نہیں ہوں، اس لیے کالج اوقات کے بعد یا تو کتابوں سے مکالمہ کرتا ہوں، دور رہنے والے دوستوں کو خط لکھتا ہوں یا پھر باہر کے مناظر سے علیک سلیک میں وقت گزارتا ہوں۔ کتابیں تو کبھی چُپ نہیں ہوتیں، میں ہی تھک جاتا ہوں اور تھکاوٹ کی کینچلی اُتارنے کی غرض سے باہر درختوں، پرندوں، دُور ایستادہ پہاڑوں اور اُن پر سے گزرتے بادلوں کے جلوس کو دیکھنے لگتا ہوں۔ کتابیں بڑی چَرب زبان ہوتی ہیں، بس ذرا آپ کو خشوع و خضوع اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مگر قدرت کے مناظر گونگے تو نہیں، ہاں نہایت کم گو ضرور ہیں، اور ان کی گفتگو سننے کے لیے اتنی ہی مشق اور محنت چاہیے جتنی ٹیلی پیتھی سیکھنے کے لیے۔ یعنی لفظ آپ کی زبان سے آوازوں کی صورت میں نکلنے کے بجائے آپ کے دماغ سے لہروں کی صورت میں جاری ہونے لگیں، اور بقول شاعر آپ کے کانوں کے پَٹ باہر کے بجائے اندر کی جانب کھل جائیں۔ اُدھر پرندوں کی آواز تو جلد آپ تک پہنچ جاتی ہے، مگر آوازوں میں مضمر معانی تبھی کھلتے ہیں جب صرف اپنے ہی لفظوں کے ''بامعنی'' ہونے کی بچگانہ

ضد آپ چھوڑ دیتے ہیں۔

خیر میں کمرے سے باہر برآمدے میں آتا ہوں۔ برستی پھوار، خاموش کھڑے درخت، درختوں سے کمرے کی چھت اور برآمدے کی دیوار تک آتے جاتے پرندے اور سامنے پُر ہیبت پہاڑ پر آوارہ پھرتے بادل مجھے دوستانہ لہجے میں اپنی مجلس میں بلاتے ہیں۔ کمرے کی بند محدود دنیا نے مجھے جس گھٹن سے دوچار کیا تھا، وہ قدرتی نظاروں کی آواز سنتے ہی دَبے پاؤں رفو چکر ہو جاتی ہے، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ کمرے سے برآمدے تک محض چند قدم اٹھانے میں احساساتی سطح پر کتنا آگے نکل آیا ہوں۔ کوئی چھتری تانے گزرتا نظر آتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے درخت اس پر قہقہے لگا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں، بھائی! یہی تیرا اہم پرشرف ہے، اپنی ذات اور جسم میں مقید رہنا! تو فطرت سے کتنا بھاگتا اور بچ کر چلتا ہے، تو نے اسے اپنا دشمن سمجھ رکھا ہے، اس سے ڈرتا ہے۔ ہماری طرف دیکھ، ہم اپنے ننگے بدن پر فطرت کو جھیلتے ہیں اور ایک حرف، شکایت کا منہ سے نہیں نکالتے۔ میں درختوں کو توجہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ بالکل ساکت کھڑے ہیں، جیسے نہ وہ خوش ہوں نہ خفا۔ کسی طویل ریاضت کے بعد گویا انھیں نروان مل چکا ہو۔ وہ نہ خوشی کے جوش سے تالیاں پیٹ رہے ہیں نہ دکھ کی گمبھیرتا سے بین کر رہے ہیں۔ خوشی اور دکھ کے عین درمیان کی کوئی پراسرار کیفیت ان پر طاری ہے۔ میں نے سرسبز چھتنار درختوں کو ہواؤں میں ناچتے اور گاتے بھی دیکھا ہے اور خزاں میں انھیں ٹنڈ منڈ لٹی پٹی حالت میں بھی، جیسے ان کے سب افراد خاندان ہلاک ہو چکے ہیں۔ مگر اب اس بوندا باندی میں وہ ان دونوں انتہائی کیفیتوں کی کسی درمیانی منزل پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہی کیفیت میں نے اچھے شعرا اور تخلیق کاروں کے چہروں پر اور ایک سال کا بچہ گود میں اٹھائے ماں کی آنکھوں میں بھی مشاہدہ کی ہے۔

سامنے کے پہاڑ پر سے بادلوں کے جتھے بڑا ماں بڑا ماں گزر رہے ہیں۔ لگتا ہے بادل پہاڑوں کو ہمدردی کے گیت سنائے جا رہے ہیں۔ بھائیو! گھبراؤ نہیں، تم صدیوں سے ایک جگہ جمے کھڑے ہو۔ استقامت کا بوجھ اٹھائے تم تھک چکے ہو گے، ہمیں تم ہمیشہ رشک سے دیکھتے ہو کہ ہم کتنے آزاد ہیں مگر تمھیں معلوم نہیں کہ ہماری آزادی بکھر جانے میں ہے۔

گھنے بادلوں کے ایک بڑے قافلے نے پہاڑ، بالکل ڈھانپ دیا ہے اور اب سارا منظر ہی بدل گیا ہے۔ دور کے مناظر کے چھپ جانے سے قریب کا منظر کہیں زیادہ اُجلا ہو گیا

ہے۔سامنے کے درختوں کا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ شوخ اور پیارا ہو گیا ہے۔ پیچھے سے پہاڑ کی موجودگی نے اُن کو کتنا معمولی اور چھوٹا...... بلکہ بے نام سا بنا رکھا تھا۔اب ان کا قد بھی بڑھ گیا ہے اور ان کی شخصیت اپنی جانب متوجہ کرتی ہے،ایک بڑے وسیع تناظر میں چیزوں کی جداگانہ حیثیت کس طرح گم ہو جاتی ہے!

دھند بھی عجیب ہے۔چیزیں تو سدا اپنی جگہ پر موجود رہتی ہیں۔دھند انھیں چھپا دیتی ہے،جیسے پہاڑ کو بھی اس نے اپنی اوٹ میں کر لیا ہے۔غصہ،اجنبیت،نفرت اور تعصب بھی تو دھند ہی ہیں جو آدمی کی شخصیت کی بلندی اور کشادگی کے آگے بھاری پردہ سا گرا دیتی اور نفرت اور تعصب خوب میک اَپ کر کے آنکھیں دکھانے لگتے ہیں اور ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اپنی بلند قامتی کا رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں......دراصل اَبرِ کثیف کے ہَٹ جانے سے جس طرح قریب کے مناظر زیادہ شوخ اور چلبلے ہو جاتے ہیں،اسی طرح غصہ اور اجنبیت کا کُہر چھا جانے سے آدمی کی شخصیت کا بالائی رخ ''چمکنے'' بلکہ شعلے اگلنے لگتا ہے اور قریب کی چیزوں اور افراد کو جھلسا ڈالتا ہے۔یوں بھی قریب کی اشیا کی تادیر دیکھے چلے جانے سے آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ یا تو اپنا گلا گھونٹتا ہے یا دوسروں کا گلا کاٹتا ہے۔شاید جنگلی درندوں کی بربریت کا باعث بھی یہی ہے کہ وہ کبھی کھلے منظروں اور حدِ نظر تک پھیلے آسمان کو نہیں دیکھ پاتے۔اگر شیر جنگل سے،سانپ بل سے، بھیڑیا غار سے نکل کر کھلے مقامات پر رہنا شروع کر دے تو اس کی ساری درندگی ہوا ہو جائے۔ ہرن اس لیے معصوم اور محبت کا سمبل ہے کہ وہ میدانوں کی کشادہ بے کراں فضا میں رہتا ہے۔یہی حقیقت ہمیں ان پرندوں کی صورت میں مجسم نظر آتی ہے،جو بیک وقت اُڑتے بھی ہیں اور زمین پر بھی چلتے ہیں۔یہ امن اور آشتی اور عالمی اخوت کی علامت ہیں۔ان کے مقابلے میں وہ پرندے جو ہمیشہ بلند پرواز پر رہتے ہیں اور زمین کی گہرائیوں کو پستی سمجھ کر نیچے نہیں اُترتے،خونخوار ہوتے ہیں۔سدا آسمان کی لامحدود فضا میں تیرتے رہنے سے وہ زمین کی باس سے آشنا نہیں ہوتے،اس لیے زمین کے باسیوں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔

فاصلے اور قُربت نے انسان کے فکری اعمال کو بھی بے تحاشا متاثر کیا ہے۔فلاسفر بے کنار فاصلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔قریب کی اشیا کو حقیر جان کر دور اُفق کو معتبر سمجھتا ہے۔ فلسفیوں کے بارے میں لطیفہ بھی مشہور ہے کہ وہ آسمان کی پہنائیوں میں فکر و خیال کی پینگیں

اُڑاتے ہوئے اپنے پاؤں تلے موجود زمین کو بھول جاتے ہیں اور چلتے چلتے اچانک راستے کے کسی گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ پہلے زمین کو بھولتے ہیں، پھر زمین پر چوٹ کرتے ہیں۔ زمینی وجود سے حقارت کا نظریہ گھڑتے ہیں۔ اُدھر سائنس اشیا کا دِقت نظر سے مطالعہ کرتی ہے۔ فلسفی دھند کو فریبِ نگاہ قرار دے کر ہمیشہ کشادہ آفاق میں کھویا رہتا ہے۔ سائنس دان بھی دھند کی نفی کرتا ہے اور اشیا کے باطن میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ جب کہ ایک فنکار کشادہ آفاق اور اشیا کے باطن میں ایک رَبط اور توازن دریافت کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ دھند کو ایک بنیادی حقیقت سمجھتا ہے۔ اُس کا عملِ تخلیق دھند کی کومل ریشمی، گریز پا فضا میں ہی انجام پاتا ہے۔ اس کا بدن زمین کی کچی سوندھی خوشبو میں شرابور ہوتا ہے، مگر آنکھیں جو اس خوشبو کے نشے سے مَست ہوتی ہے، آسمان کی طرف اٹھتی ہیں...... تخلیق کار تو ایک بارانی کسان ہے جو آسمان سے اُترنے والے بارانِ رَحمت سے مٹی کے جَل تھل ہونے کے بعد ہی فصل بوتا ہے۔ وہ ہَل چلاتے ہوئے جس سوندھی خوشبو سے سرشار ہوتا ہے، وہ زمین کے دریدہ بدن ہی سے پھوٹ رہی ہوتی ہے۔

تانگہ

میرا دوست ''ط'' میرے ہمراہ سفر کرنے سے کتراتا ہے۔اس کے خیال میں سفر ہمیشہ جیٹ طیارے کی طرح آگے اور بلندی کی طرف ہوتا ہے، جبکہ میں ''سفر معکوس'' کا عادی ہوں۔ چناں چہ جب میں فلائنگ کوچ کے بجائے بس میں بیٹھنے کی تجویز پیش کرتا ہوں یا شہر میں رکشہ ٹیکسی کے بجائے تانگے کی سواری پر اِصرار کرتا ہوں تو وہ بھڑک اٹھتا ہے اور بڑے دانشورانہ موڈ میں مجھے کوسنے دینے لگتا ہے کہ میں رَجعت پسند ہوں، نئی دنیا، اس کی ترقی اور اس کے تقاضوں کا ساتھ دینے سے گھبراتا ہوں۔زمانہ جو قیامت کی چال چل رہا ہے، اس کو پہچانتا تک نہیں ہوں۔ جب میں اپنے دوست سے کہتا ہوں کہ تیز رفتاری جان، مال اور آبرو کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے تو وہ مجھے مایوسانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے: یار، خطرناک تیز رفتاری نہیں، تمھاری رَجعت پسندی ہے! ہم جب ہوائی جہاز فلائنگ کوچ یا ٹیکسی میں سفر کرتے ہیں تو اپنے ترقی پسند ہونے کا گویا اعلان کرتے ہیں۔ ہم ایک ایک لمحے کی قدر کرتے ہیں اور عزیزم، تیز رفتاری اس کا عہد کا مزاج ہے، عصر کی روح ہے جو اس روحِ عصر کو ماننے سے انکار کرتا ہے، غبارِ راہ کی طرح قدموں میں پامال ہوتا رہتا ہے! میرے دوست کا لیکچر اکثر اِس بات پر ختم ہوتا ہے کہ اگر میں زمانے کے مزاج َ پہچان جاتا تو کبھی تدریس کے پیشے کا انتخاب نہ کرتا۔ میں اپنے دوست سے مزید بحث نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ میرے پاس اپنے مؤقف کی حمایت میں دلائل نہیں ہوتے بلکہ میں اپنے اُس اِحساس کو دلائل کی مدد سے اپنے دوست تک منتقل نہیں کر سکتا، جو تانگے پر سفر کرنے سے

مجھے ودیعت ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کی کشادہ مصروف سڑک پر جہاں کاریں، بسیں، ویگنیں، رکشے وغیرہ اولمپک ریس کی طرح بھاگے جا رہے ہوں، تانگہ بڑی فرسودہ سی چیز لگتا ہے۔ فاصلوں کو پھلانگتی ہوئی گاڑیاں، فاصلے کو بیچ بیچ طے کرتے ہوئے تانگے پر یوں آوازے کستی نظر آتی ہیں جیسے جھکی کمر والے بوڑھے پر نٹ کھٹ بچے فقرے کس رہے ہوں۔ مگر تانگہ کیا واقعی گزرے وقتوں کی یادگار ہے، جسے اب سڑکوں کے بجائے میوزیم میں ہونا چاہیے؟

تانگے نے قدیم اور جدید کے سنگم پر جنم لیا ہے۔ قدیم زمانہ پاؤں کا اور جدید عہد پہیے کا ہے۔ اوّل اوّل جب انسان کے قدم زمین پر پڑے تھے تو زندگی پہاڑی رستے کی طرح سخت مشکل تھی، جسے ہموار کرنا تو کجا اس پر چلنا موت کی بانہوں میں جھولنے کے مترادف تھا مگر موت کی بانہوں میں انسان جبھی جاتا جب اس کے پاؤں اُکھڑ جاتے۔ انسان نے اپنی تمام توانائیاں پاؤں میں مرتکز کر دیں۔ پھر کیا تھا، پاؤں نے سپہ سالار کا رُتبہ حاصل کر لیا اور انسان کے دوسرے اعضا سپاہی بن گئے۔ اس زمانے میں نان ونفقہ اور فاصلے کی اڑچنوں سے لے کر دشمنوں تک کو زیر وزبر کرنے کی ساری جنگیں پاؤں کی سپہ سالاری میں لڑی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاؤں عزت، حرمت اور طاقت کی علامت بن گئے۔ کسی کے لیے احترام اور مروّت کے اظہار کی ضرورت پیش آتی تو اس کے پاؤں چھوئے جاتے۔ حریف سے اعترافِ شکست مطلوب ہوتا تو اس کے گھٹنے ٹکوائے جاتے، گویا پاؤں بہ نفسِ نفیس اپنی ناطاقتی کا اعلان کرتے۔ کسی کی علمی عظمت کا اقرار کر کے تحصیلِ علم کی خواہش ہوتی تو زانو تہ کیے جاتے۔ آپ دیکھیں کہ پاؤں کی اس قدیم حیثیت کے اُٹھ جانے سے طاقت اور عزت کے معیار کس قدر بدل گئے ہیں اور زانو تہ کرنے کی رسم کیا اٹھی ہے کہ علم سیکھنے کی خواہش کا جنازہ ہی نکل گیا ہے۔

انسان نے زندگی کے پہاڑی رَستے کو جب پاؤں کی مدد سے قدرے ہموار کر لیا تو پرندوں کی دیکھا دیکھی پاؤں کو سمیٹنے اور زمین سے اُوپر اٹھنے کی آرزو کی۔ یہ آرزو اس وقت پوری ہوگئی جب انسان نے کسی طرح پہیہ ایجاد کر لیا۔ پاؤں سے پہیے کی طرف پیش قدمی انسانی تہذیب میں ایک عظیم اور دُور رَس عمل قرار پائی، مگر ابھی پہیہ پاؤں ہی کی نو آبادی تھا۔ وہ ہر قدم پر پاؤں کا محتاج تھا۔ پھر ایک وقت آیا جب پہیے نے پاؤں سے بغاوت کر کے اپنی کامل خود مختاری کا نہ صرف

اعلان کر دیا بلکہ پاؤں کو اپنے بندی خانے میں ڈال دیا۔اب پاؤں، پہیے کی سپر پاور ریاست میں دَر دَر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔

خیر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تانگے کی موجودگی میں پہیے کا رعب و دبدبہ گھٹنے ٹیکے نظر آتا ہے۔ مجھے تانگے پر سفر اس لیے عزیز ہے کہ اس میں پہیہ نابینا فقیر کی طرح دونوں ہاتھوں سے ''پاؤں'' کے کندھے پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ پہیے نے اپنی نمود کے پہلے دن ہی سے انسان کا رشتہ زمین سے کمزور کرنے کی مکروہ کوشش شروع کر دی تھی، اور اب وہ مسلسل یا تو زمین کے حسن کو روڑا مٹی کرنے میں لگا ہوا ہے یا پھر انسان کو زمین سے دور سیاروں پر لے جانے میں کوشاں ہے، اور انسان بے چارہ اپنے ہی ہاتھوں بنائی چیز کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ گھوڑے نے ہر بحران میں انسان کی یاوری کی ہے اور اب وہ تانگے میں جُت کر پہیے کی طاغوتی سپاہ کے آگے تن کر کھڑا ہے۔

تانگے کی شکل میں تیز رفتاری اور سُست روی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہیں۔ تیز رفتاری، زمین اور گرد و پیش سے انسان کو علیحدہ کر کے ایک مصنوعی دنیا میں بند کر دیتی ہے، جب کہ سُست روی میں انسان کو دھرتی اور اِردگرد جکڑ لیتے ہیں۔ یوں دونوں، انسان کی فطری آزادی کے سبک دھارے کے آگے بند ڈال دیتی ہیں۔ تانگے کا کمال یہ ہے کہ وہ دو اِنتہاؤں کے درمیان ایک سنگم کو وجود میں لاتا ہے اور انسان اس سنگم پر ٹھہر کر اپنی فطری آزادی کے اَمرِت رَس کو پی سکتا ہے۔ تانگہ آپ کو منزل کی طرف بھی لے جا رہا ہوتا ہے اور آس پاس کی اشیا، افراد اور حالات سے بھی مربوط رکھتا ہے۔ ٹیکسی رکشے میں تو اِدھر اُدھر کی چیزیں ہلکی سی جھلک دکھلا کر آناً فاناً منہ چھپا لیتی ہیں۔ شاید وہ آپ کی تیز رفتاری پر احتجاج کر رہی ہوتی ہیں۔ یوں بھی ٹیکسی کار وغیرہ آپ کو جلد از جلد منزل کے سپرد کرنے کے لیے مری جا رہی ہوتی ہیں، خواہ اس کوشش میں آپ کے قدم زندگی کی آخری منزل پر ہی کیوں نہ جا پڑیں۔ دوسری طرف تانگے میں اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں اِلّا یہ کہ کوئی ہیوی ویٹ گاڑی غصے میں اپنا توازن کھو کر تانگے سے ٹکرا جائے۔ تانگے کے آگے گھوڑا، چلتے ہوئے صرف اپنے طاقتور ہونے کا مظاہرہ ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی جمالیاتی حس کو بھی حرکت میں لاتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں اِس فنکارانہ انداز سے رکھتا اور اُٹھاتا ہے کہ لگتا ہے، وہ چلتے چلتے رقص کر رہا ہو۔ ساتھ ساتھ مترنم گھنٹیوں ایسی آواز بھی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ رقص کی مسرت میں

گھوڑے کے صرف پاؤں ہی سرشار نہیں ہوتے، گھوڑے کا پورا جسم بھیگ رہا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گھوڑے کو ایک طویل عرصے تک محض ایک طاقتور جنگی جانور سمجھا جاتا رہا اور اس کے اندر چھپے فنکار پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ چنانچہ گھوڑے کو بطور فنکار متعارف کروانے کا سہرا تانگے کے سر بندھتا ہے۔

تانگے میں سفر کے ڈھنگ اِنسانی اور ویگن، رکشہ میں سفر کے انداز تجارتی ہیں۔ یوں تو تانگہ آپ کو اِردگرد کی پھڑکتی زندگی کے تماشے میں شریک رکھتا ہے، کوچوان بھی آپ کو دوروپے کی سواری سے زیادہ اپنا بھائی بند سمجھتا ہے، اور بسا اوقات تو اپنا بھائی خیال کر کے اپنی اور اپنے بال بچوں کی بپتا سناتا، اپنے گھوڑے کے شجرہ نسب کا انکشاف کرتا، دوسرے تانگے والوں کی غیبت کرتا اور کسی سواری کی حکایت لذیذ تک سناڈالتا ہے۔ جب کہ ویگن کا کنڈیکٹر آپ کی حیثیت کو کرائے کے پیسوں کی مقدار کی ترازو میں جانچتا ہے۔ اس کی بَلا سے، آپ کس سٹیٹس یا معزز مقام کے حامل ہیں۔ کرائے کے علاوہ جو کنڈیکٹر آپ سے بات کرے، سمجھیے وہ خفیہ ایجنسی کا کوئی کارندہ ہے۔

ویسے آپ غور کریں تو تانگہ انسانی تہذیب کے بہترین عناصر کا مرکب ہے۔ تانگے کی ترکیب میں انسان، جانور اور مشین بیک وقت موجود ہیں، اور ذرا اُن کی ترتیب پر نظر ڈالیں تو کیسا انوکھا اِنکشاف ہوتا ہے۔ مشین، جانور کے پیچھے ہاتھ باندھے اس کے حکم کی منتظر ہے۔ جانور نے اپنی باگیں انسان کے ہاتھ میں تھمائی ہیں۔ یوں گھوڑا انسان اور مشین کے درمیان میں ہے۔ شاید گھوڑا ہی مشین کی شیطانی چال کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ چوں کہ انسان گھوڑے پر ہر لحظہ موجود ہے، سو گھوڑا مشین سے کوئی سَودے بازی کر ہی نہیں سکتا۔ انسان اور مشین کے درمیان سے گھوڑا جوں ہی باہر ہوا ہے، مشین نے انسان کو مشین بنانے میں دیر نہیں کی۔ میں کوچوان کو تانگہ چلاتے دیکھ کر انسان کے اَنفس و آفاق پر غالب آنے کا منظر دیکھتا ہوں۔

تانگے کی کہانی کا ایک رُخ اور بھی ہے!

تانگہ ایک باغی بھی ہے جو قصباتی زندگی کے ٹھہرے نظام کے خلاف بغاوت کا پھریرا لہرا کر شہر کی طرف نکل آیا تھا مگر شہر میں تو پہیے کا راج تھا۔ چناں چہ شہر نے نیم دِلی ہی سے پاؤں اور پہیے کے اِس امتزاج کو قبول کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شہر نے تانگے کو ایک پناہ گزیں کے طور پر جگہ

دی ہے اور اسے مستقل ویزا جاری کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں کہ جب پہیہ ایک فوری نافذ العمل آرڈی نینس کے ذریعے تانگے کو اپنے راج پاٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھگا دے گا۔ پھر کیا گاؤں اس باغی کو حقوقِ شہریت از سرِ نو دے سکے گا؟ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ پہیے نے اپنے کارکن گاؤں گاؤں اُتار دیے ہیں جو بڑی تیزی سے قصباتی طرز زندگی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ چناں چہ کچھ معلوم نہیں کہ گاؤں کی خودمختار حیثیت کب تک باقی رہے گی اور کب تک وہ تانگے کو اپنے سینے سے لگائے رکھے گا!

خاموشی

جس طرح دن کی ہنگامہ آرائی کے بعد رات کا طلسماتی سکوت آتا ہے، اسی طرح زیادہ بولنے کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ بھی آتا ہے۔ ہم صرف زبان ہی سے نہیں باقی حسیات سے بھی اپنا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً ہر حس بعض مخصوص محسوسات و خیالات کے اظہار پر قدرت رکھتی ہے۔ کان، ناک، آنکھیں، رخسار، ہونٹ اور شاید پورا بدن بولتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زبان کے علاوہ باقی آلاتِ اظہار جھوٹ نہیں بولتے بلکہ بول ہی نہیں سکتے۔ آپ آنکھوں میں وہ چمک اپنی مرضی اور کوشش سے پیدا نہیں کر سکتے جو ایک بچے کی آنکھوں میں اس وقت جلوہ گر ہوتی ہے جب دن بھر کے انتظار کے بعد وہ اپنی ماں کو دیکھتا ہے اور پھر لپک کر اس سے چمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح آپ ارادتاً اپنے رخساروں پر وہ گلابی رنگ نہیں لا سکتے جو پیار کے معصوم اور مقدس جذبوں کی گرمی کا حاصل ہے۔ اور آپ کے ہاتھوں میں کوشش کے باوجود وہ گرمی اور گداز کبھی نہیں آ سکتا جو دو سچے دوستوں کے مصافحہ کرنے سے ازخود آ جاتا ہے۔ ہماری حسیات اپنے اظہار کے محل و مقام سے بخوبی واقف ہوتی ہیں، اس لیے زیادہ وقت خاموش رہتی ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے، چوں کہ یہ زیادہ دیر خاموش رہتی ہیں لہٰذا اپنے اِظہار کے موقعوں کی رازداں ہوتی ہیں۔

خاموشی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جو آلاتِ اظہار کے تھک جانے کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں میٹھی سی غنودگی کی کیفیت ہوتی ہے اور مکان و مقام سے بے خبر ہو کر نشیلے خوابوں میں کھو جانا بھی اس خاموشی کی صفت خاص ہے۔ دوسری طرح کی خاموشی اظہار کی بے

معنویت سے منکشف ہونے پر جنم لیتی ہے۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو اَدھ کھلے غنچے اور شام کے وقت سوئے ہوئے سرس کے درخت میں یا سخت محنت کے بعد مزدور کے خاموش لیٹنے اور فنکار کے تخلیقی عمل کے دوران چُپ ہونے میں ہے۔ مزدور، حال کی سختی اور بے مزگی سے فرار چاہ کر بے خبری میں کھو جانا چاہتا ہے جب کہ فنکار حال پر قدم رکھ کے لفظوں کی آکاس بیل سے خود کو آزاد کرتا اور یوں اپنی معنویت دریافت کر رہا ہوتا ہے۔

فی الاصل خاموشی ایک سنجیدہ کیفیت ہے جو اِنکشاف وعرفان کی عمودی پرواز کے لیے BASE فراہم کرتی ہے۔ ہماری شخصیت گہری اور تہہ دار ہے۔ ہم نے اپنی شخصیت کو منظر عام پر لانے کے لیے بانگِ دُہل کا حربہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً کبھی اپنی قوتِ اِظہار کا سکہ جمانے کے لیے لطائف وظرائف سے کام لیا ہے تو کبھی دوسروں پر اپنی فوقیت کا جال پھینکنے کے لیے سیاسی وسماجی مسائل پر اپنی آرا پیش کی ہیں۔ کبھی اپنے ذوقِ سلیم پر مہرِ تصدیق ثبت کروانے کے لیے شاعری فرمائی ہے تو کبھی مشاعرے میں کسی مقبول شاعر کے شعروں پر داد دینے میں غیر معمولی جوش وخروش کا مظاہرہ کیا ہے، اور اس سے بے خبر رہے ہیں کہ ہماری جذباتیت ذوقِ سلیم کی حدوں کو بھی پار کر گئی ہے۔ خاموشی، اظہار کے اِن حربوں کی لاحاصلیت ہم پر عیاں کرتی ہے۔ خاموشی صرف چپ ہو جانے یا بے حِس وحرکت ہونے کا نام نہیں، خاموشی پورے بدن اور پوری شخصیت میں سرایت کر جاتی ہے اور آدمی کی گردشِ خون سے لے کر اُس کے طرزِ احساس تک کو بدل دیتی ہے۔ چناں چہ خاموشی کی دولتِ بیدار سے مالا مال شخص پہلے کی طرح ڈرائنگ روم یا ہوٹل میں بیٹھ کر دوستوں سے گپ شپ نہیں اڑا سکتا۔ وہ افرادِ خانہ سے اجازت لیے بغیر کسی ایسی جگہ چلا آتا ہے جہاں کئی اشیاء اور مناظرِ خود بھی خاموش ہوتے ہیں اور خاموشی کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ بھی کیے ہوتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی خاموشی ہی نے اسے بتایا تھا کہ اگر اس نے اجازت مانگنے کی غلطی تو جواب میں اسے افرادِ خانہ کی تند وتیز آوازیں سننا پڑیں گی۔ سو وہ اجازت لیے بغیر ہی چل پڑا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سدھارتھ جب بیوی بچوں کو خیر باد کہہ رہا تھا تو بیوی اسے آنسو بھری خاموشی سے دیکھ رہی تھی! خاموشی سے بہتر کوئی زبان نہیں، نہ دلیل کی حاجت نہ جرح کی گنجائش!

خاموشی کی بظاہر بنجر کھیتی سے عرفان وانکشاف کا جو پودا پھوٹتا ہے، وہ ایک نئے اِظہار کا اعلامیہ ہے۔ یوں خاموشی بیک وقت تخریبی اور تعمیری قوت ہے۔ یہ پرانی چیزوں کو زمین بوس کرتی اور نئی

تعمیر کرتی ہے۔ زندگی کا اِرتقا اِسی طرح جاری رہتا ہے۔ موسمِ خزاں بھی درختوں پر چھانے والی وہ خاموشی ہے جو پرانے پتوں کو گراتی ہے تا کہ ان کی جگہ نئے اور توانا پتے لے سکیں۔ سُنا ہے کہ بعض درخت پھولوں کے موسم سے کچھ عرصہ پہلے مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ غالباً زندگی کی تمام صورتیں خاموشی اور مراقبے سے ضرور گزرتی ہیں تا کہ گزشتہ ورفتہ کی معنویت سے آگاہ ہو کر نئے سفر کی سمت اور منزل کا تعین کیا جا سکے۔ جس طرح زندگی کے لیے دِل کی دھڑکنوں کے مابین مختصر وقفے کا پیدا ہونا ناگزیر ہے ،اسی طرح خاموشی شاید اِظہار کی درمیانی صورت ہے۔ خاموشی دَم لینا ہے تا کہ آگے چلیں!

خاموشی جبر کی لاتعداد ساعتوں کے بعد آزادی کی نوید ہے۔ انسان پوری عمر جبر سے آزادی پانے میں کوشاں رہتا ہے کہ انسان کی حقیقی مسرتیں ''آزادی'' کی مرہونِ منت ہیں۔ اظہار بھی تو ایک جبر ہے۔ ہم اپنے اِحساسِ تنہائی کو مٹانے یا دوسروں کی خوشنودی پانے کی خاطر اِظہار کے طویل سلسلے کے غلام ہیں۔ اظہار ہمارے پاؤں کی زنجیریں ہیں، خاموشی انھیں توڑتی اور ہمیں ہوا کی طرح سبک اندام کر دیتی ہے۔ بڑھاپے میں پہنچ کر آدمی بڑی حد تک ان زنجیروں سے آزادی پا چکا ہوتا ہے مگر چوں کہ زندہ ہوتا ہے، اس کے دل کی دھڑکتی چلتی رُکتی ہیں اور پھر چلتی ہیں، اس لیے وہ مکمل آزادی کی نعمت سے فیض یاب نہیں ہو پاتا۔ ہمارے آلاتِ اظہار عام حالات میں خاموش اور لاتعلق سے رہتے ہیں مگر بڑھاپے میں اِن پر کچھ خاص کیفیات کتبوں پر کُھدی تحریروں کی طرح کندہ ہو جاتی ہیں۔ ایک تو سارے بدن پر لکیروں کا جال پھیل جاتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ زندگی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا سلسلہ ہے۔ ہاتھ میں رَعشہ آ جاتا ہے جو دیکھنے والوں کو یہ بتاتا ہے کہ زندگی میں اتنے تیز مت چلو، رُک جاؤ، جس طرف بھاگ رہے ہو وہ سَراب ہے، خود کو مت تھکاؤ! بینائی کم ہو جاتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اب آنکھوں کے آگے دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے وہ اپنے اندر کے انسان کے لیے ہے۔ یوں بڑھاپا شعورِ ذات سے نوازتا اور باہر کی دنیا کی رِیاکاریوں اور تضادات سے آگاہ کرتا ہے۔ بڑھاپے میں اظہار اگرچہ واضح طور پر کم ہو جاتا ہے مگر سرے سے ختم نہیں ہوتا۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب اظہار کی ساری صورتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ انسان فنا کے گھاٹ اُتر جاتا ہے، ایک گہری، اَمِٹ اور بے کراں خاموشی میں ڈوب جاتا ہے۔ موت کی خاموشی زندگی کے سارے مشکل سوالات کو لاجواب کر دینے والا جواب ہے۔ مگر ایک سوال ابھی باقی ہے: کیا خامشیِ مرگ بھی ایک وقفہ ہے، ایک نئے جنم، ایک اظہار کا؟ سوچنا چاہیے!

پڑھنا اور مطالعہ کرنا

پڑھنا اور مطالعہ کرنا مزاجاً دو مختلف سرگرمیاں ہیں۔ پڑھنا وہ ذمے داری ہے، جسے پورا نہ کرنے کی صورت میں آپ کو ''شوکاز نوٹس'' جاری کیا جاسکتا ہے یا آپ کی پیشہ وارانہ ترقی خطرے میں پڑسکتی ہے، جب کہ مطالعہ کرنا جبر و خوف سے یکسر آزاد فعل ہے۔ پڑھنے کا عمل چند متعین مقاصد اور مقررہ اہداف کو سَر کرنے کی خواہش سے متحرک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوچے سمجھے اور بندھے ٹکے نظام کے تابع ہے۔ مطالعہ اس وضع کے نظامِ مقاصد سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ مطالعہ میں انسان اپنی لاشعوری احتیاجات کو سیراب کرتا ہے۔

پڑھنے کی تمام چیزیں منظم منصوبے کی پیداوار ہیں۔ اخبار، معلوماتی ڈائجسٹ اور اطلاعاتی لٹریچر وغیرہ پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ جس طرح ارادی کاوشیں اپنی عمر کے لحاظ سے گھڑی بھر کی مہمان ہوتی ہیں، اسی طرح اخبار اور معلوماتی لٹریچر بھی بہت جلد اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان سے آدمی کا تعلق بس اتنا ہی رہ جاتا ہے، جتنا سپر ٹرین میں بیٹھ کر کھڑکی میں سے گھوم کر گزرتے ہوئے مناظر سے۔ یہ مناظر ذہن پر کوئی گہرا اور انمٹ نقش چھوڑنے قاصر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مطالعہ کرنا دامنِ کوہ میں بیٹھ کر ایک جانب کے جھرنے کی لحہ لحہ ڈوبتی اور ابھرتی آواز کو سننا، سامنے بچھی سبزے کی بساط پر نظریں جمانا، اُونچے پہاڑوں پر نظر بھر کے دیکھنا اور ان کے اَسرار پر غور کرتے رہنا ہے۔ یعنی بیک وقت لطف اندوز ہونا اور فکری ژولیدگی سے نجات پا کر ذہنی طور پر بلند ہونا۔ مطالعہ انسان کو مزاج کا دھیما پن اور ترفع کی کیفیت عطا کرتا

ہے۔ آپ دامنِ کوہ میں بیٹھ کر خود کو سامنے کے، دیو قامت اور پُر شکوہ پہاڑ سے کم تر محسوس نہیں کرتے۔

پڑھنے کے دوران آپ دوسرے لوگوں، اداروں اور اشیا وغیرہ کے بارے میں چند ضروری معلومات تو اپنی مٹھی میں بند کر سکتے ہیں اور مٹھی کو کھول کر آپ کوئی جادوئی عمل بھی دہرا سکتے ہیں، مگر اس سے آپ وہ روحانی کیفیت کشید نہیں کر پاتے جو مطالعہ کی دین ہے۔

مطالعہ میں مکالمہ مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ پڑھنا صرف سننا ہے، جب کہ مطالعہ کرنا سننے کے ساتھ خود اپنی سناتا ہے۔ پڑھنے کے عمل میں آپ کے عقب میں ایک شخص قاعدے قانون کی چھڑی لیے کھڑا ہوتا ہے اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں کٹیلے احکامات جاری کرتے ہوئے آپ کو ناک کی سیدھ میں چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ یوں آپ کے اندر فطری بغاوت کا اگر کوئی بچا کھچا عنصر موجود ہے تو اسے مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلسل سیدھے، ایک ہی رُخ میں چلنے رہنے سے آپ کی گردن اکڑ جاتی ہے اور اس پر مستزاد آپ چیزوں کو ایک مخصوص اور محدود زاویے سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ کے دوران آپ کے اندر سے ایک ملائم قوت دوستانہ روپ میں بیدار ہوتی ہے۔ آپ پر روز کے معمولات نے جو بوجھ لاد رکھا ہے، یہ قوت اسے اتارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے، یعنی آپ کی فطری بغاوت کو بیدار کرتی ہے۔ پھر آپ آزادی کے ساتھ چہار سُو گھوم پھر سکتے ہیں، بلکہ اگر چاہیں تو اَفلاک کی سیر بھی کر سکتے ہیں۔

پڑھنا سفر کرنے اور مطالعہ سیاحت کرنے کے مماثل ہے۔ سفر مقصد اور اِفادے کی ڈور سے بندھا ہے، جب کہ سیاحت ایک داخلی بے چینی سے تحریکِ پاتی ہے۔ آپ ''پڑھنے'' کے سفر میں مبتلا ہوں تو نُو بہ نُو مناظرِ اور حیرت انگیز اشیا، واقعات کی آگاہی پاتے ہیں، مگر یہ آگاہی اس خزانے کے مانند ہے، جسے پرانی داستانوں میں مہم جُو تلاش کرتے پھرتے تھے تاکہ اپنی طاقت وعظمت کا رُعب جما سکیں۔ اس کے برعکس ''مطالعے'' کی سیاحت میں مبتلا ہو کر آپ زندگی کے اَن دیکھے مَنطقوں کا نظارہ کرتے ہیں، کچھ لمحوں کے لیے آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ چند ثانیوں کی یہ خُود فراموشی آپ کو خُود شناسی کے متعدد، انوکھے زاویوں سے آگاہ کرتی ہے۔

مطالعے کے قابل صرف وہی کتابیں ہیں جن میں نسلِ انسانی کے گہرے تجربات پیش

کیے گئے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہوئے انسان انھی تجربات سے دوبارہ گزرتا ہے۔ ''پڑھنا'' صرف اپنے عہد سے، گردوپیش کی ٹھوس حقیقتوں سے آگاہ رہنا ہے، جب کہ مطالعے میں انسان اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کی دریافت کرتا ہے، موجود کے پار نا موجود سے اپنے تعلق کی بازیافت کرتا ہے...... اسی لیے جو لوگ محض ''پڑھتے'' ہیں ان کی شخصیت بکھری بکھری اور سطحی ہوتی ہے، مگر مطالعہ کے عادی لوگوں کی شخصیت میں ایک وقار، تہذیب اور سلیقہ ہوتا ہے۔ پڑھنے کے عادی لوگوں سے مل کر آپ خودنمائی کا ہنر سیکھتے ہیں جب کہ صاحب مطالعہ سے ملاقات آپ کے لیے روحانی انشراح کا سامان بنتی ہے۔

ہر اچھی تحریر احساسات و تصورات کی ایک انوکھی ترتیب ہے۔ اس ترتیب کا انسان کی روح اور ذات سے گہرا تعلق ہے۔ روزمرہ زندگی کے تضادات اور اُلجھنیں ہماری ذات کی ایک فطری ترتیب کو توڑنے پھوڑنے پر کمر بستہ رہتی ہیں۔ یوں اکثر ہمارے اندر ''ایمرجنسی'' کی حالت نافذ رہتی ہے۔ مطالعہ ہمیں اس کربناک حالت سے نجات دلانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ مطالعہ کے عمل سے ہم تحریر کی ''انوکھی ترتیب'' کا ادراک کر کے خود اپنی گم گشتہ ''ترتیب'' کی کنہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

مطالعہ صرف کتابوں کا نہیں، فطرت اور کائنات کا بھی کیا جاتا ہے۔ آپ بولتے ہیں تو مناظر فطرت توجہ سے سنتے ہیں، اور جب اُن کی باری آتی ہے تو آپ ہمہ تن سماعت بن جاتے ہیں۔ یوں ایک دوسرے کو اپنے دُکھ درد میں شریک کرتے ہیں۔ مطالعہ انسان کو پوری کائنات سے ہم آہنگ ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم بالعموم شخصی صدمات کے زیر اثر لوگوں سے اور کائنات سے روٹھے ہوئے سے رہتے ہیں یا پھر دنیا جہان سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مطالعہ تصادم کی فضا کو پارہ پارہ کرتا اور دوستی کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔ مطالعہ کی عادت اختیار کر کے آپ کبھی ہجوم تنہائی میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتے، بلکہ تنہائی میں تو آپ آشنائی کے متعدد انوکھے زاویوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ اپنے ہی خیالات اور احساسات سے دیرینہ ہمدم کی طرح ملتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ اور جب ایک بار آدمی اپنے خیالات و احساسات سے دوستی کی ڈور سے بندھ جاتا ہے تو پھر دوسروں کے خیالات پر بھی اُسے پیار آنے لگتا ہے۔ دوسروں کا نقطۂ نظر سن کر آپ نہ تو متعصبانہ اختلاف کی بلند چٹان پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نہ احساس کمتری

کی کھائی میں جا گرتے ہیں، بلکہ دوسروں کے پہلو میں اعتماد اور خلوص کے ساتھ کھڑے ہونے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہونا اور ایک دوسرے کے چھوٹے بڑے قد کو مسئلہ نہ بنانا انسانیت کا دیرینہ خواب ہے۔ مطالعہ اس خواب کی تعبیر بن سکتا ہے! لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہو پڑھنے کے طویل، سست میکانکی عمل کو ترک کیجیے اور مطالعہ کے مختصر اور آزاد عمل کو اپنا لیجیے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

سرما کی دُھوپ

دسمبر کا آخری عشرہ ہے اور سرما کی چھٹیاں ہیں۔ میں یہ چھٹیاں اپنے گھر عالمِ بےفکری میں گزارا کرتا ہوں۔ سرما کی چھٹی کا مزہ مصروف رہنے یا کل پر اٹھائے ہوئے کاموں کو نپٹانے سے کِرکِرا ہو جاتا ہے۔ چھٹی کا عیش تو لمبی سیاہ راتوں میں بےنقط کہانیاں سنانے، سننے، صبح مَن مرضی سے یوں اٹھنے جیسے زندگی کے سب ضروری اُمور نپٹ چکے ہوں، ناشتہ اُتنی بےفکری سے کرنے کہ کھانا زندگی کی عشرت کو بڑھانے کے لیے ہو اور گھر میں دوستوں کا انتظار اور ان سے ہر غیر ضروری موضوع پر تمام غیر اہم تفاصیل کے ساتھ بات چیت کرنے میں ہے۔ چھٹی فرائض منصبی، معاشرتی مصروفیتوں اور خانگی الجھنوں کے کلاوے سے نکل کر تصورِ جاناں (اور اگر ممکن ہو تو محفلِ جاناں) میں کھونے کا نام ہے مگر ایسی جاناں جو ہجر زدہ زندگی کے بجائے بےفکر، لذت آگیں زندگی میں شرابور ہو۔

چھٹیاں تو تین ماہ کی بھی ہوتی ہیں مگر یہ جبری رُخصت کی مانند ہیں۔ یہ پاؤں کی بیڑیوں کو اتارنے کے بجائے اُن کی گرفت کو مزید سخت کر دیتی ہیں۔ اس گرم موسم میں سُورج راکشس بن جاتا ہے۔ ہاتھ میں آگ کے دُرّے لے کر جملہ مخلوقات کی یوں خبر لیتا ہے جیسے بلا تخصیص سب کو دوزخی قرار دیا جا چکا ہو۔ ہوا سورج کی باندی بن کر اُس کے جلتے وجود میں سب کو جھونکنے کے لیے بےدردی سے ہانکنا شروع کر دیتی ہے۔ صرف درخت دھرتی سے وفاداری نبھاتے ہیں، وہ سورج کے ہر وار کے آگے تَن کر کھڑے رہتے ہیں۔ وہ آگ کو سوم رَس جان کر

پیتے اور ایک انوکھے نشے میں مست ہو کر ''سزا یافتہ'' مخلوقات کو ٹھنڈی ٹھار چھاؤں بخشتے ہیں۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں، اگر زمین درختوں کے وجود سے خالی ہوتی تو سورج اور دیگر سماوی آفتیں دھرتی کی کوکھ کو بنجر اور انسان کے بدن کو راکھ کر چکی ہوتیں۔ درخت کسی اُوتار کی طرح انسانیت کو ''دوزخ'' کی غذا بننے سے بچاتے ہیں۔ مگر ادھر ایک عرصے سے حضرت انسان نے لوہے کے کلہاڑے سے اپنے ''محسنوں'' کا قتلِ عام شروع کر رکھا ہے۔

گرمیوں میں آدمی اپنے پنکھ سمیٹ کر اپنے اندر سمٹ جاتا ہے، جیسے ایک دیوتا دھرتی پر امن قائم کر کے غار میں لمبی نیند میں چلا گیا تھا اور اسے نہ اپنی نہ اردگرد کی سُدھ بُدھ رہی تھی نہ دلچسپی۔ اس کے برعکس سردیوں میں پنکھ سنورتے اور کُھل جاتے ہیں مگر آدمی اُڑ کر بے انت خلا میں گم نہیں ہو جاتا۔ سُورج مہربان دیوتا بن کر دھرتی کے سب زخموں پر پھاہا رکھتا ہے اور یہ زخم ہوا کے ملائم ماتا بھرے ہاتھوں کے لمس سے جلدی جلدی مندمل ہونے اور گنگنانے لگتے ہیں۔ بقول شاعر زندگی پھر سے خود کو بُننے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

سرما کے اِنہی مہرباں دِنوں میں مَیں ناشتہ کر کے چھت پر دھوپ میں آ بیٹھتا ہوں۔ پہلے تو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی دھوپ ہے جو کبھی مجھے گنہگار قرار دے کر سزا دیتی تھی۔ پھر سوچتا ہوں، سارا کمال تو فاصلے کا ہے۔ فاصلہ کم ہو تو قربت آنکھیں چندھیا دیتی اور کبھی کبھی تن بدن بھسم کر ڈالتی ہے اور فاصلہ زیادہ ہو تو دوری آنکھوں میں بیکراں خلا اُنڈیل دیتی اور وجود کو واہمہ بنا ڈالتی ہے۔ موزوں فاصلہ ہی چیزوں کو اپنی اصل قامت کے ساتھ اجاگر ہونے اور مسرت بخش ہونے کے قابل بناتا ہے۔ ویشیا اِس لیے حقیر ہے کہ اس کے بدن کی قربت حسیات کو بھڑکا کر پھر دفعتاً سرد کر دیتی ہے۔ محبوبہ اس لیے پیاری ہے کہ دوری کی بنا پر حسیات کو انگیخت تو کرتی ہے، بھڑکا کر راکھ کرنے کا سامان نہیں کرتی، مگر اکثر یہ دوری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ محبوبہ ایک واہمہ بن جاتی ہے اور آدمی مجنوں کی طرح صحرا کی ہرنیوں میں محبوبہ کی شبیہ دیکھنے کے اِلتباس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرد اور عورت کے رشتے میں موزوں فاصلہ بیوی کی صورت میں نصیب ہوتا ہے۔ پر اس کا کیا کیا جائے کہ مرد بیوی میں یا تو ویشیا تلاش کرتا ہے یا محبوبہ۔ اس موزوں فاصلے کا کوندا سرما کی دھوپ میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ موزوں فاصلہ نہ اتنا تپاتا ہے کہ حِدت کا احساس ہی ختم ہو جائے اور نہ اس قدر ریخ کرتا ہے کہ حِدت کی کامنا ہی مر جائے۔ موزوں فاصلہ احساس اور کامنا کو زندہ

بلکہ سدا بہار رکھتا ہے۔

سرما میں غسلِ آفتابی فقط جسمانی عیش ہی نہیں ایک روحانی تجربہ بھی ہے۔ گرمیوں کی شعلہ بار دھوپ سے اپنے بدن کو بچانے کے لیے آدمی بدن کا چاکر بن کر رہ جاتا ہے۔ جسم کسی وڈیرے کی طرح اپنی آسائش کے لیے آدمی سے بیگار لیتا ہے۔ مگر سردیوں کی دھوپ جسم کو ایک مخملی احساس میں شرابور کر دیتی ہے۔ جسم ایک حاکم نہیں، ایک بے تکلف دوست بن جاتا ہے۔ گرمیوں میں فرد اور فرد کے درمیان ہی نہیں جسم اور روح میں بھی نفاق پیدا ہوتا ہے۔ وہ مقناطیس کے دو مخالف سِروں کی طرح ایک دوسرے سے دور کھنچتے ہیں جب کہ سردیوں میں جسم اور رُوح مَن تو شُدم تو مَن شُدی، کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی روحانی تجربہ ہے، جب جسم کی بوجھل موجودگی دم توڑ دیتی ہے۔ جسم فنا نہیں ہوتا بلکہ لطیف خوشبو میں بسی کیفیات کا منبع بن جاتا ہے۔ جسم کی خوشبو سے مَشامِ جاں کو عطر بیز کرنے کا انوکھا ڈھنگ اہلِ مغرب نے اپنا رکھا ہے۔ وہ سردیوں کی مخملی دھوپ میں سمندر کنارے اپنے بدن کو تہذیب کے ہر چولے سے آزاد کر دیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان کے بدن پر تہذیب کا لیپ کچھ زیادہ ہی گہرا ہوتا ہے جو ایک طرح سے جسم کی نفی کا عمل ہے۔ جسم کی نفی رشی مُنی اور صُوفیا بھی کڑی ریاضتوں سے کرتے ہیں۔ ایک تہذیبی عمل میں جسم کو اَڑیل گھوڑا سمجھ کر قابو میں لانا چاہتے ہیں اور دوسرے جسم کو روحانی پرواز کی راہ میں حائل بھاری پتھر سمجھ کر چکنا چور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ شیخ چلی کی طرح اسی شاخ کو کاٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر بیٹھتے ہیں۔ سچا رُوحانی تجربہ اپنے پاؤں تلے کی زمین کو حقارت سے رَوند کر نہیں حاصل کیا جا سکتا، بلکہ جسم اور زمین کو اپنی خوشبو میں بھیگ جانے کا موقع عطا کرنے سے ہاتھ آتا ہے۔

سرما کی دھوپ میں اپنے دوستوں سے گپ شپ کرنا مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ گپ شپ طویل اور اکثر بے مقصد ہوتی ہے، اس لیے اس میں کشادگی اور رُوح کو سبکسار کرنے والا لطف ہوتا ہے۔ کمروں کی گفتگو بالعموم مختصر، جہت کے شعور سے آراستہ اور منصوبہ بندی کے تابع ہوتی ہے جب کہ سرما کی دھوپ میں اندر کے سارے منصوبے ڈھل جاتے ہیں۔ یوں بھی اگر ہم بے مقصد گپ شپ نہ کریں تو ایسے بھگت بن جائیں جو گِنے چُنے لوگوں سے گِنی چُنی باتیں کرتے ہیں یا وہ آمر بن جائیں جس کی زبان صِرف حکم صادر کرنے کے لیے کھلتی ہے۔ بولتی زبانوں، سوچتے

دماغوں اور سرکش سروں کو کاٹنے کا حکم ازبانوں کے چاک پر نو بہ نو لفظوں کے ظروف گھڑے جاتے رہیں تو انسانوں کے آپسی تعلقات بھی مضبوط رہتے ہیں اور خود زبان کا ارتقا بھی جاری رہتا ہے۔ ویسے تو دنیا میں کیے جانے کے قابل بہت تھوڑی باتیں ہیں، ان قلیل باتوں کے مقابلے میں آدمی کی عمر بہت لمبی اور بھاری ہے اور میں سوچتا ہوں، عمر کے خشک بھورے پہاڑ کو گفتگو کی کدال سے کاٹتے کاٹتے شاید کسی دن ہم چمکتے موتی ایسا لفظ پالیں جس سے اندر کی گھٹن آلود تاریکی جمعہ، نور بن جائے۔

☆☆☆

میں سوچتا ہوں سو میں ہوں

اس عظیم کائنات کو وجود میں لانا میرا کارنامہ نہیں، مگر اس کے وجود کا قیام میرے بغیر محال ہے۔ میں جب نہیں تھا تو کائنات کا رنگ ڈھنگ کیا تھا، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر میرے آنے سے کائنات میں بہت معمولی سہی، کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ زندگی کے اس بہت بڑے قافلے میں، مَیں ایک بے نام فرد سہی، پر یہ کیا کم ہے کہ قافلے کے کچھ لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ بعض کو میرا آنا اچھا لگا ہے اور بعض کو حد درجہ ناگوار، اور مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ میرا وجود زندگی کی ٹھہری ہوئی سطح پر ایک کنکر کی طرح گرا ہے جس سے ہلچل پیدا ہوئی ہے...... مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو اس کائنات کا ایک حصہ کسی عضوِ معطل کی طرح بے کار ہوتا یا اپنے وجود کی گواہی حاصل کرنے کی دعائیں کر رہا ہوتا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دنیا کے ایک حصے کو وجود کی تنویر دی ہے، بے کار بے حس پڑے اعضاء کو فعال بنایا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے زندگی سے معمور رکھنے کے لیے یہ کائنات طرح طرح کی نعمتیں انتہائی اخلاص اور والہانہ محبت سے عطا کر رہی ہے۔ اکثر مجھے پتا بھی نہیں چلتا کہ میرے جینے کا مدار اِن نعمتوں پر ہے۔

کائنات میں ہر گھڑی واقعات کی تلاطم خیز لہریں بن اور بکھر رہی ہیں۔ مَیں ساحل پر کھڑا تماشائی نہیں ہوں، واقعات کی بے شمار لہریں میرے وجود میں سے اُٹھتی ہیں۔ بعض واقعات بند کلی کی طرح ہوتے ہیں جنھیں صبا بن کر میں چھوتا ہوں تو وہ کھل جاتے ہیں، اِردگرد

کے سوئے عناصر آنکھیں ملتے ہوئے جاگ پڑتے ہیں اور یوں اس بُجھی کائنات میں زندگی کی چہکار سنائی دینے لگتی ہے۔ مگر کچھ واقعات کچھار میں پڑے خوں خوار شیر کی مانند ہیں۔ میری کسی حرکت سے اُن کا سکون غارت ہوتا ہے تو وہ بہت غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ اپنی فلک گیر دھاڑ اور اپنے خوں آشام پنجوں سے گرد و پیش کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ کائنات میری اس قسم کی حرکتوں کو اپنے روایتی سخت قوانین کی خلاف ورزی پر محمول نہیں کرتی، کیوں کہ اکثر شیر کا اوّلین ہدف تو خود مَیں ہی ہوتا ہوں۔ کبھی عجیب صورت حال ہے...... کوئی کائناتی عنصر مجھے اُون کے گولے کی طرح اُدھیڑ رہا ہے اور مَیں بے بسی کی اندوہناک کیفیت میں اپنے اُدھڑنے کا تماشا کر رہا ہوتا ہوں۔ مَیں بیک وقت موجود بھی ہوتا ہوں اور نہیں بھی! مگر شاید یہ بات نہیں، اَصل یہ ہے کہ میں بیک وقت کئی جگہ پر "موجود" ہو سکتا ہوں، لیکن میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ مجھے کس وقت کہاں موجود ہونا چاہیے۔ بس میری اس کمزوری کے باعث مجھے زندگی میں مسائل اور غم زیادہ ملے ہیں اور خوشیاں کم!

بچپن میں مجھے باور کرایا گیا کہ میں اشرف المخلوقات ہوں۔ بہت عرصہ اپنے عظیم ہونے کے زعم میں مبتلا رہنے کے بعد مَیں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا منصب دیگر مخلوقات پر اپنا شرف و برتری جتانا نہیں۔ میں تو کرکٹ کا وہ کھلاڑی ہوں جو کریز پر کھڑا ہے۔ میری ٹیم کے کپتان سمیت باقی کھلاڑی ڈریسنگ روم میں عیش و آرام سے بیٹھے ہیں۔ میں نے گیارہ کھلاڑیوں میں سے گیند کو نکال کر سکور کرنا ہے میرا ساتھی کھلاڑی ہر لحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ میری جگہ لے لے۔ اسے میرے سکور کرنے یا آؤٹ ہو جانے سے کوئی غرض نہیں۔ اس پر کئی تماشائیوں کی بے تاب نظریں مستزاد ہیں۔ جوں ہی باؤلر میری جانب گیند پھینکتا ہے، میرا ساتھی کھلاڑی عقاب کی طرح میری کریز کی طرف جھپٹتا ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے کریز سے پَل بھر میں نکال باہر کرے۔ گیند کے مجھ تک پہنچتے ہی تماشائیوں کی نگاہیں گھورنے لگتی ہیں، اور شدت سے یہ احساس دلاتی ہیں کہ دیکھو ہم نے تمھارے کھیل سے محظوظ ہونے کے لیے اپنا وقت اور پیسہ صَرف کیا ہے۔ کبھی مَیں لگاہوں کے یہ کلمات سن کر خود اعتمادی سے لیس ہو جاتا ہوں اور کبھی گھبرا جاتا ہوں، مگر جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ٹیم میں میری شمولیت کئی کھلاڑیوں کو شکست دینے کے بعد ممکن ہوئی اور اب آؤٹ ہوتے ہی میں کھیل کے منظر نامے سے غائب ہو سکتا ہوں تو جَم کر کھیلنا شروع

کر دیتا ہوں اور ایسے ہی لمحے مجھ پر اپنی مخفی صلاحتیں آئینہ ہوتی ہیں۔ ایک بار میں نے ایسا زوردار شاٹ کھیلا تھا کہ ہزاروں تماشائیوں کے جذبات میرے بلے کی زد میں آ گئے تھے اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ اگر ہر میچ میں کم از کم اسی طرح کا ایک شاٹ کھیلوں تو سٹار کھلاڑی بن کر پریس کے قلم اور کیمرے کو اپنی جانب مرکوز رکھنے اور کئی منچلے جواں حسین چہروں کو ہاتھوں میں آٹو گراف بک لیے اپنے اِنتظار میں کھڑا کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔

تاریخ کا آغاز بھی میں نے نہیں کیا، پر تاریخ کے ایک باب کا مختصر سا حصہ میرے خونِ جگر سے رقم ہو رہا ہے۔ مجھے یہ سپارہ کورے کاغذ کی صورت نہیں ملا۔ اس پر جا بجا نقطے اور دھبے پڑے تھے۔ مجھے ایک غیر اہم سے گنجان حصے پر تھوڑی سی جگہ ملی ہے اور میں ایک موہوم سے نقطے کی صورت اِس حصے پر رقم ہوں۔ کئی بار گرد و نواح کے نقطوں نے پھیل کر مجھے اپنی لپیٹ میں لینے اور بے نام و نشاں کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے صفحۂ ہستی سے کُھرچ ڈالنے میں اس لیے کامیاب نہیں ہوئے کہ میرے رنگ کچے نہیں نہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ میرے ساتھی نقطے مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ جس طرح مقتول کا خون قاتل کے ہاتھوں کی ریکھاؤں میں جذب ہو کر قاتل کو ایک اَذیتِ مسلسل میں مبتلا رکھتا ہے، اسی طرح میری ناک میں رہنے والوں کو ڈر ہے کہ کہیں میری شکست اُن کی مضبوط شخصیت کے اِنہدام کا باعث نہ بَن جائے۔ کئی بار میرا نقطہ آسا وجود اپنی حد بندیوں کو پار کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ کبھی اِس بے کنار کائنات میں چُلبلے کبوتر کی طرح تفریحاً اُڑا ہے، کبھی کائنات کو ایک چیستاں جان کر اِسے بوجھنے کے جتن میں مبتلا ہوا ہے، اور کبھی زندگی کے حادثات، سانحات اور واقعات کے تہ در تہ جہاں میں اُتر بھی گیا ہے۔ اکثر نقطے کے ظاہری روپ کو بعض واقعاتِ کی تُند لہروں نے زَک پہنچائی ہے، مگر کوئی بھی سیلابِ بلا نقطے کو اکھاڑ کر بہا لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں جانتا ہوں، مورخوں نے کئی مرتبہ تاریخی کھیلے کیے ہیں۔ ایک گدا کر شاہ اور ایک زیالو کو بھکاری بنا کر پیش کیا ہے، مگر میرے ساتھ یہ تاریخ نہیں دہرائی جائے گی۔ کیوں کہ میں نہ تو کرائے کے مورخوں سے تاریخ لکھوا رہا ہوں اور نہ ایسے صفحے پر میری تاریخ لکھی جا رہی ہے جو معمولی قیمت پر بازار سے دستیاب ہو۔ تاہم مجھے اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ صفحہ ایک روز کائنات کی نوٹ بک میں سے پھاڑ لیا جائے گا۔

دوسرے انسانوں کی طرح مجھے بھی زندگی میں چند خواب، چند جذبے، چند خواہشیں اور چند دوست بہت عزیز ہیں۔ میرے لیے یہ سب مکان کی چار دیواروں کی مانند ہیں اور خود میری ذات اِن دیواروں پر اٹکی ہوئی چھت کی صورت ہے۔ زمین اور سماج کی طرف سے آنے والی آفات میرے ساتھ دیواروں کو بھی نشانۂ ستم بناتی ہیں، مگر آسمان سے نازل ہونے والی بلاؤں کا ہدف تنہا میں ہی ہوتا ہوں۔ میرے لیے یہ دیواریں آسرا تو ہیں مگر ساتھ ہی انھوں نے ''دیوار'' کا روایتی کردار بھی ادا کیا ہے۔ جب کوئی کمرے میں داخل ہو، تو اس کی زیادہ گپ شپ ''دیواروں'' سے رہتی ہے، مجھ سے بات کرنے کے لیے اسے اپنا سب کچھ اُونچا اور دستار کچھ نیچی کرنی پڑتی ہے۔ اور اس کا تکلف وہ کم ہی کرتا ہے...... ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہمارے روزانہ کے بے مزہ معمولات کی تہ میں کچھ جذبے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ کبھی ہم قطعاً انجانے میں اُن کی خاطر سَر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اور شاید یہی وہ جذبے ہیں جو شہد کے چھتے کی طرح اِس بھری پُری دنیا میں ہمیں منفرد وجود ہونے کا اعزاز بخش سکتے ہیں۔ اور انسان اِن کی پروا کرے نہ کرے، یہ جذبے بڑھتے، پھولتے اور پھیلتے رہتے ہیں، اگر اِن کی پرداخت پر توجہ دی جائے تو بہتر پھل مل سکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ خشک پہاڑی پر اُگنے والی کانٹوں بھری جھاڑی میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس پر انسان پھٹی پرانی ''لیر'' کی طرح ٹنگا نظر آتا ہے۔

☆☆☆

کیا گزر رہے ہے!

تقریباً تین ہفتے بستر علالت کی زینت بنے رہنے کے بعد میں آج اُٹھ کر بیٹھنے، احساس آزادی کے ساتھ سوچنے اور یہ چند سطریں لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ اِن تین ہفتوں میں میرا سارا ذہنی منظر بدل کر رہ گیا ہے۔ کیوں کہ جو کچھ لیٹ کر دیکھا، سوچا اور محسوس کیا جا سکتا ہے اسے بیٹھ کر یا چلتے پھرتے دیکھنا اور سوچنا سی طور پر ممکن نہیں۔ مجھ پر کُھلا ہے کہ لیٹے ہوئے آدمی (مریض، بچے، بوڑھے) کا زندگی اور کائنات سے متعلق فلسفہ اور ہوتا ہے اور چل پھر کر زندگی کی ہاہمی میں شریک ہونے والے کی آئیڈیالوجی دوسری طرح کی ہوتی ہے۔ مجھے یہ بات بھی اب سمجھ میں آئی ہے کہ اگر کسی قوم کے تہذیبی مزاج میں تبدیلی لانا مقصود ہو تو...... لیٹی ہوئی قوم (یعنی قحط زدہ، آفت زدہ یا آسائشوں کی ماری ہوئی) کو چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا جائے اور زندگی کی جنگ میں ہمہ دَم متحرک قوم کو ایک دَم فرصت اور آسائش میں مُبتلا کر دیا جائے، قوم کا سارا تہذیبی ڈھانچہ بدل جائے گا۔ یہ نسخہ طبقۂ شعراء پر بھی آزمایا جا سکتا ہے!

علالت کا یہ دورانیہ میں نے بستر کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کی رفاقت میں بھی بتایا ہے۔ عام حالات میں جسم ہمارے لیے ایک گھر گرہستن کی طرح ہوتا ہے جس کی خدمات کے ہم اس درجہ عادی ہوتے ہیں کہ اس کی موجودگی تک محسوس نہیں ہوتی مگر بیماری کے عالم میں یہی جسم ایک وی آئی پی قسم کے مہمان کا رُوپ اختیار کر لیتا ہے، جس کی سیوا، دلجوئی اور خبر گیری میں ہم کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ علالت ہی میں یہ منکشف ہوتا ہے کہ جسم تو ایک کشتی کی طرح ہے جو پُر خروش

دریائے حیات میں ہمیں سلامت لیے پھرتی ہے۔ یہ کشتی خستہ یا خراب ہو جائے تو بسا اوقات دریائے حیات کی ہیبت ہی آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔ نیز اس دریا میں رنگ رنگ کی خوں خوار مخلوقات رہتی بستی ہیں جو ہمہ وقت بدن کو ہوسناک نظروں کی زد میں رکھتی ہیں.........اور مریض کو خواب میں ڈائنوسار ایسی خوفناک شکلوں میں دِکھتی ہیں۔ چناں چہ آدمی اپنے معمولات کو فی الفور معطل کر کے اپنے جسم کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو جاتا ہے اور پُر ہیبت مخلوقات سے اپنے بدن (اور روح) کو بچانے کے لیے اپنے بھولے بسرے عقائد کا انتہائی خلوص کے ساتھ اقرار تازہ کرتا ہے۔ اس اقرار میں غیر معمولی رقت دیدنی ہوتی ہے، جیسے پرائمری سکول کا بچہ سبق بھول جانے پر ماسٹر صاحب اور اس کے ہاتھ میں لہراتے ڈنڈے کو دیکھ کر گڑگڑاتا ہے۔ بیماری میں یہ بات آئنہ ہوتی ہے کہ ہر لاچار، مایوس اور اندر کی تھکاوٹ سے چُور آدمی لازماً مذہب کا سہارا لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات لاچاری اور تھکان کی جھاگ کے بیٹھنے کے بعد وہ اکثر اپنے مذہبی میلانات کو بھول جاتا ہے۔ شاید انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ کمزوری کے عالم میں وہ خود کو ایک طاقتور ہستی سے وابستہ کر لیتا ہے مگر جوں ہی اس کی اپنی طاقت بحال ہوتی ہے، اس پر خُودی کا نشہ چڑھ جاتا ہے اور اُسے دور و نزدیک کوئی اپنے جیسا نظر نہیں آتا، یا شاید اصل بات یہ ہے کہ آدمی میں ''طویل المیعاد گریز'' اختیار کیے رکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بیماری یا کسی دوسرے بحران کے وقت وہ اپنی ذات کے اُونچے بُرج سے اپنی اَنا کا پرچم اتار کر قادرِ مُطلق کے نام کا علم بلند کرتا ہے تو یہ اپنے روزمرہ اور روٹین سے گریز ہے۔ وہ صبح شام اپنی اَنا کے پرچم کو سلام کرنے کا عادی ہوتا ہے اور روٹین یا عادت ایک نشہ ہے جسے زیادہ دن ترک کیے رکھنا آسان نہیں۔

بیماری بیک وقت باہر اور اندر سے حملہ آور ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ جسم کی قلم رو پر شب خوں مارتی ہے اور دوسری طرف یہ دل اور رُوح کو اپنی گوریلا کارروائیوں کا نشانہ بناتی ہے۔ دشمن دُوبدو ہو تو اس کا مقابلہ کرنا اور اس کے جنگی داؤ پیچ کو سمجھنا آسان ہوتا ہے مگر جب عدو چُھپ کر وار کرے تو سنبھلنا تک مشکل ہوتا ہے لیکن اس کے رُوح پر لگائے گئے چرکوں کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہو گا۔ ہر بڑی اور لمبی بیماری انسان کو داخلی بحران کا تحفہ ضرور دے جاتی ہے!

بیماری کے دنوں میں انسان کی ذات طرح طرح کی آوازوں کا مسکن بن جاتی ہے۔ ان آوازوں میں کووں کا سا بے معنی شور بھی ہوتا ہے، مرغ کی اذان کی طرح کسی نئے سمے کی آمد کی

بھی اطلاع بھی ہوتی ہے اور درد کی نہ رُک سکنے والی کراہیں بھی ہوتی ہیں۔ مریض کے اردگرد ڈاکٹروں، حکیموں کی رٹی ہوئی تسلیوں اور عزیز رشتہ داروں کے اندیشوں کا شور ان پر مستزاد ہے۔ کچھ صاحب فراش تو اس باہر کے شور کی مسلسل ضربوں سے ہی آنجہانی ہو جاتے ہیں، مگر کچھ خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اندر کی مُنڈیر پر نغمہ سنج مُرغ اور کوے میں فرق کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ کوے تو پاس پڑوس کے ہوتے ہیں مگر بعض ایسے ہوتے ہیں جو آدمی کی اپنی ذات کے براعظم کے کسی دور دراز جزیرے سے تشریف لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیماری میں چوں کہ اندر کا سارا موسم بدل جاتا ہے، اس لیے نہ صرف بہت سی ہجرتیں واقع ہوتی ہیں بلکہ ذات کے اب تک نامعلوم خطے بھی دریافت ہونے لگتے ہیں۔

انسان کے پاس دُکھوں کے وار سہنے کے لیے جسم سب سے بڑی ڈھال ہے۔ بیماری میں یہ ڈھال خستہ ہو جاتی ہے اور اس پر ایک سیلاب بلاٹوٹ پڑتا ہے۔ آدمی کا حافظہ جو عام دنوں میں پرسنل اسسٹنٹ کی طرح ہر حکم کی فی الفور تعمیل کرتا ہے، بیماری کے عالم میں کسی عجائب گھر کے خفیہ تہ خانوں کا منظر پیش کرتا ہے اور قدیمی فراموش کردہ زمانوں کے آثار کو نظروں کے سامنے یوں چُن دیتا ہے جیسے دلھن کے جہیز کو رخصتی سے قبل چُن دیا جاتا ہے۔ یہ سب آثار آدمی کی اپنی ذات کے حصے بخرے ہوتے ہیں مگر آدمی جب پہلی بار ان کو دیکھتا ہے تو اسی طرح نظریں چرانے لگتا ہے جیسے اُس نے گلی میں پھرنے والے ننگ دھڑنگ بچوں میں خود اپنے بچوں کو بھی دیکھ لیا ہو۔ بچے چوں کہ باپ کے ذہنی تحفظات سے بے خبر اور آزاد ہوتے ہیں، اس لیے وہ باپ کو دیکھتے ہی اپنے ننگے، غبار آلود جسم کے ساتھ باپ سے آن لپٹتے ہیں۔ ذات کے فراموش کردہ حصے بخرے بھی آدمی کے اندر شور مچانے لگتے ہیں۔ گویا مرغِ سپیدۂ سحر کی آمد کا طبل بجاتا ہے۔ مگر بسترِ علالت پر دراز شخص کو سپیدۂ سحر کی زیارت صرف اس وقت نصیب ہوتی جب وہ اپنی زرد آنکھوں سے بیماری کی سیاہ عینک کچھ دیر کے لیے اتارنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ بیماری اگر آسیب ثابت ہو تو پھر فقط کوؤں کی کائیں کائیں ہی سنائی دیتی ہے۔ میں نے تین ہفتے بیماری کا کمبل اوڑھے گزارے ہیں، بہت کائیں کائیں بھی سنی ہے اور مرغِ سحر کی اذان بھی! میرا خیال ہے کہ مُرغِ سحر کی زمزمہ پیرائی اس وقت ساعت میں رَس ٹپکاتی ہے جب بہت سی کائیں کائیں سے پردۂ ساعت مبتلائے آزار رہ چکا ہو۔ اسی لیے میں نے یہ عرصہ ایک گرداب زدہ سمندر میں ہردم ڈانوں ڈول کشتی میں گزارا

ہے، مگر مجھے وقفے وقفے سے اُس ساحل کا رُخ زیبا بھی نظر آ تا رہا ہے، جس کی تمنا میں زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ تاہم گرداب سے ساحل تک سفر میں مسافر پر کیا گزرے ہے، اس کا بیان شیریں نہیں ہے۔

ہر بیماری جاتے جاتے وضع دار مہمان کی طرح آدمی کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھ کے جاتی ہے۔ تاہم وہ اُس کا ظرف ضرور دیکھتی ہے۔ مجھے اب کی بار بیماری زندگی کا ایک انوکھا معنی دان کر گئی ہے۔ میں یہ تحفہ اپنی ڈرائنگ روم کی زینت بنانے کے بجائے خلقِ خدا کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

انسان کی حالت کچھ ایسی ہے کہ وہ سمندر کے عین درمیان ایک چھوٹے سے جزیرے پر ایستادہ ہے۔ سمندر کی بے پناہ وسعت اور دہشت اُس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی ہے، مگر اسے دہشت کو عبور کر کے سمندر کی گہرائیوں میں چھپی اس سنہری مچھلی کو پکڑنا ہے جو ہاتھ کی گرفت میں آتے ہی اپنی چکنی جلد کے کارن پھسل جاتی ہے اور سمندر کی مواج سطح پر کوئی نشان تک بھی نہیں چھوڑ جاتی۔ لیکن آدمی کو اُس سنہری مچھلی کو پکڑنے کی کوشش بہرحال جاری رکھنی ہے اور اپنے ہاتھوں پر سنہری چکنی جلد کے لمس کو باقی رکھنا ہے۔ نیز خوشی اور غم کی سرحد پر اُس پر جو گزرے ہے، اُس کا گلہ بھی نہیں کرنا ہے۔

قلم

قلم کی قوت کا تو خوب چرچا ہوا ہے مگر قلم کے اَسرار کو مَس کرنے کی سعادت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ قلم کو تلوار سے زیادہ طاقتور قرار دینے والے وہ ''اہل قلم'' تھے جو تلوار چلانا چاہتے تھے مگر تلوار اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے تلوار کی مرہون خواہشوں کو قلم کی مدد سے پورا کرنے کی کوشش کی اور قلم کو تلوار کی طرح ہی کاٹ دار بنا ڈالا۔ حالاں کہ قلم کی فطرت میں آلاتِ حرب جیسی سرے سے کوئی بات ہی نہیں۔ قلم تو اسی طرح گہرے اَسرار کا حامل ہے جس طرح ایک سچا اہل قلم اور یہ خود کائنات۔ قلم کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ اہل قلم اور کائنات کے اَسرار کو اپنی نوک سے چھونے پر قادر بھی ہے!

میں قلم کو پراسرار بنا کر دَر پردہ اسے طاقتور شے ثابت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کیوں کہ ہر وہ شے جس پر اَسرار کا جالا بُن دیا جائے، ایک طاقت کی حامل ہو جاتی ہے۔ مجھے آج شام قلم کے اَسرار کے ایک تازہ رُخ سے متعارف ہونے کا تجربہ ہوا ہے۔ جب سے لکھنا سیکھنا ہے، تب سے اب تک درجنوں قلم میرے استعمال میں آچکے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں قلم صرف لکھنے کا ایک آلہ تھا۔ ایک ٹوٹ گیا تو بازار سے دوسرا لے آئے، نہ پہلے کے جانے پر نوحہ خوانی نہ دوسرے کی آمد پر شادیانے۔ مگر جب سے تخلیق و تصنیف شروع کی ہے، قلم ایک زندہ وجود بن گیا ہے بلکہ میرے وجود کا ایک اٹوٹ انگ...... جو نہ صرف میرے خیال کو اپنا خیال اور میرے احساس کو اپنا اِحساس بنا لینے کی غیر معمولی قدرت رکھتا ہے، بلکہ خیال و احساس کو لفظوں میں ڈھال

کر انھیں حیاتِ جاوید عطا کرنے کا معجزہ بھی دکھاتا ہے۔ چناں چہ میں قلم کے بغیر خود کو ہمیشہ ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ قلم میری ذات کی تکمیل میں میرا معاون ہے۔ میرے اور قلم کے اِس تعلق خاطر کا کم لوگوں کو علم ہے۔ قلم سے میرے رشتۂ خاص کا تقاضا ہے کہ میں اسے اپنے سینے کی بائیں جیب میں رکھوں تا کہ یہ میرے دل کے قریب رہے۔ کچھ لوگ راستے، دفتر حتیٰ کہ بس میں بھی قلم پر نظر پڑتے ہی مانگ لیتے ہیں۔ جانے انھیں قلم دیکھتے ہی کیا کیا یاد آنے لگتا ہے! قلم کا انسان کی کھوئی ہوئی چیزوں اور گُم شدہ حصوں سے کوئی گہرا سمبندھ ضرور ہے! میں برے اخلاق کا آدمی نہیں ہوں مگر قلم مانگنے والوں سے قلم نہ دینے کی بداخلاقی کا اِرتکاب کرنے کو اکثر جی چاہتا ہے۔ جی یہ بھی چاہتا ہے کہ اُن سے پوچھیں: صاحب، خود قلم کیوں نہیں رکھتے؟ مانگتے ہوئے ہوئے شرم نہیں آتی ......مگر جب قلم دینا ہی پڑ جائے تو اتنی احتیاط ضرور کرتا ہوں کہ کیپ اپنے پاس رکھتا ہوں۔ میں نے بہت سے قلم اس بھروسے میں گنوائے ہیں کہ مانگنے والے اپنی ضرورت پوری کر کے لوٹا دیں گے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ قلم وار کتاب مانگ کر لے جانے والوں نے ابھی اخلاقی پختگی حاصل نہیں کی۔

میں قلم کے اَسرار سے شناسا ہونے کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس موجودہ قلم کوئی دو برس سے ہے۔ اس دوران میں، میں نے اس قلم سے ہزاروں لفظ اور درجنوں صفحات لکھے ہیں۔ مجھے یہ طے کرنے میں خاصی دِقت پیش آتی ہے کہ میں لکھتا ہوں یا قلم! میرے بغیر قلم لکھنے کا محض ایک آلہ ہے جو ڈبوں میں محبوس رہتا ہے اور میں قلم کے بنا مٹی کا ٹھیکرا ہوں۔ میرے ہاتھ میں قلم آنے سے قلم زندہ ہو جاتا ہے، چوکڑیں بھرنے لگتا ہے۔ کائنات کی اس ڈائری کے خالی صفحات پر نئے نقش ابھارنے لگتا ہے اور کائنات کے متوازی ایک تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور میں قلم پکڑتے ہی جسم اور حواس کی قید سے آزاد ہو جاتا ہوں۔ مجھے یہ اکثر محسوس ہوا ہے کہ آدمی اپنے تخیل یا فکر وخیال میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ حقیقی آزادی تو قلم تھامتے ہی نصیب ہوتی ہے بشرطیکہ فطرت نے آدمی کو قلم تھامنے کے سلیقے سے نوازا ہو! متخیلہ کے مَرغزاروں میں آدمی کا حال پتنگ ایسا ہوتا ہے جو آزاد نہیں، ہوا کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ آدمی بھی یہاں اپنی نامراد خواہشوں کی ڈور سے بندھا ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ فکر وتخیل کی وادیوں میں آوارہ خرامی کوہ پیمائی کی ایک ایسی مہم کے مترادف ہے جس کا ہدف تو پہاڑ کی کلغی ہے، مگر مہم جو کے ہاتھ فقط گنجان

دُھند آتی ہے۔ جب کہ قلم آدمی کو پہلے موجود کے جبر سے آزاد کرواتا ہے اور پھر ایک نئے، کھلے جہان میں لے جاتا ہے، مگر اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیتا۔ قلم کبھی آدمی کو بے سہارا نہیں کرتا۔ قلم ہمیشہ سمت کے شعور اور مقصد کے احساس کے تحت رواں رہتا ہے اور اکثر صاحبِ قلم کو زندگی و کائنات کی سمت اور منتہائے تخلیق سے بھی آشنا کرتا ہے۔ یوں قلم آدمی کو جس آزادی سے ہمکنار کرتا ہے وہ صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے اور پابہ گِل بھی ہے، کی صورت ہوتی ہے۔

لیجیے میں پھر دوسری طرف نکل گیا اور قلم کے اَسرار سے متعارف ہونے کے واقعے کو اب تک بیان نہیں کر سکا۔ اَصل میں قلم کے اَسرار کی یہ بھی ایک جہت ہے کہ یہ صاحبِ قلم کے ارادے کا پابند نہیں۔ جن حضرات نے قلم کو طاقت کا ذریعہ کہا تھا، انھوں نے دراصل قلم کو اپنے ارادے کا غلام بنانے کی مکروہ کوشش کی تھی۔ وہ اسے غلام بنا کر کچھ حربی مقاصد حاصل کرنے میں تو کامیاب رہے مگر قلم کی حقیقت اُن پر کھل نہ سکی۔ جس شے کو بھی غلام کا درجہ دیا جائے اس کے مَن کے بھیتر کبھی نہیں کھلتے۔ بہرکیف مجھ پر قلم کا بھیتر کچھ اس طور کھلا ہے کہ میرے دو سالہ قلم کی نب اچانک خراب ہوگئی۔ پورے قلم کو تبدیل کرنے پر طبیعت مائل نہیں ہوئی، اس لیے میں نے نب بدل دی۔ مگر نب چلی نہیں، مجبوراً قلم بدلنے کا فیصلہ کیا، مگر میں جوں ہی نیا قلم خریدنے گیا، پرانا قلم پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ ویسے تو اکثر پرانی چیزیں راستے کا پتھر ہوتی ہیں یا پاؤں کی بیڑیاں، مگر میں حیران تھا کہ قلم نے مجھے آگے ہی آگے بڑھنے اور روایت کے بجائے جدت کا ساتھ دینے کا درس دیا ہے اور آج خود نئے کے راستے میں حائل ہوگیا ہے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی، کہیں میرا قلم کسی سیاستدان کے پاس تو نہیں رہا جو ہمیشہ ''سٹیٹس کو'' کا حامی ہوتا ہے یا میرا قلم کچھ روز میرے باس کی میز پر تو حاضر نہیں رہا، جو اپنے ماتحتوں کی معروضات پر صرف No لکھنے کا عادی ہے، مگر مجھے یاد آیا کہ مَیں نے اپنے قلم سے کبھی اتنی بے وفائی نہیں کی۔ لہٰذا اس مقدس شے کو ایسے دنیاداروں کے ہاتھ میں دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غالباً اصلی بات یہ تھی کہ (اسے میں نے قلم کے اَسرار کے طور پر پہچانا ہے) قلم کے جملہ اعضائے بدن پر جا بجا میری انگلیوں کا لَمس نقش ہوگیا تھا۔ یوں قلم خُود میری شخصیت کی توسیع ہوگیا تھا۔ اس لیے قلم کی جدائی اصل میں خود اپنے وجود کے ایک حصے کو کاٹ کر پھینکنے کے مترادف تھی۔ اور میں اتنا سفاک نہیں ہوا۔ کوئی اہلِ قلم اتنا تو کیا بالکل سفاک نہیں ہوتا۔ سفاکی کے تمام

چھوٹے بڑے مظاہرہ کوئی صاحب سَیف کرسکتا ہے یا وہ صاحب قلم، جس نے سَیف کی جگہ قلم کو دے دی ہو۔

قلم کی جرأت .... جرأتِ گفتار و جرأتِ کردار کے ذکر کے بغیر قلم کے اسرار کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ دنیا میں حق گوئی و بے باکی کا جو بول بالا ہے، وہ سب قلم کے طفیل ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی حق گو ہو گزرا ہے، جس کے ہاتھ میں قلم نہ ہو یا جس نے قلم کے تخلیق کردہ جہان سے روشنی نہ پائی ہو! اقبال نے بندہ و خدا کے مکالمے میں جو کہا تھا کہ "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" تو یہ چراغ قلم ہی تھا، جس کی آفرینش سے انسان خدا کی مانند تخلیق کرنے کے قابل ہوا۔ اندر اور باہر کی جملہ ظلمتوں کا پردہ صرف قلم ہی چاک کرسکتا ہے۔ کیوں کہ قلم سراپا نور ہے اور یہ سارا نور خودِ قلم اور صاحبِ قلم کے ذہن رَسا کی باہمی تخلیق ہے۔ آپ کہیں گے کہ ایسے "اہل قلم" بھی تو ہیں جنھوں نے اس کائنات کے شر میں اضافہ کیا ہے، بالکل ہیں مگر اس میں قلم کا کوئی قصور نہیں۔ کچھ لوگ ٹارچ کو رات کے اندھیرے میں رَستہ تلاش کرنے کے لیے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور کچھ سیندھ لگانے کے لیے۔

قلم کی رفاقت کسی ہمدمِ دیرینہ اور کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی صُحبت کے برابر ہے۔ جو قلم کی صحبت میں رہنا سیکھ لیتا ہے، وہ گویا جینا سیکھ لیتا ہے۔ قلم آدمی کے مزاج میں بے نیازی اور طبیعت میں نیاز مندی پیدا کرتا ہے، دَولت، ہَوس سے اوپر اٹھنے اور محبت و احترام میں جھکنے کے قابل بناتا ہے۔ ہر قلم بدست آدمی یا قلمکار اہلِ قلم نہیں کہلا سکتا۔ مُرشد کی طرح قلم پکڑنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ یہ باقاعدہ ایک فن ہے، جو ریاضت اور آزمائشوں کے بعد آتا ہے اور جب قلم پکڑنا آجاتا ہے تو انگلیوں میں قلم کیا آتا ہے، دو جہاں آدمی کی گرفت میں آجاتے ہیں مگر قلم اور صاحبِ قلم دو جہاں سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔ سچ بتایئے کیا قلم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت تخلیق کی جاسکی ہے۔

قلم آدمی کی باطنی سیاحت کا اسی طرح ساتھی ہے، جس طرح قدیم زمانے میں متلاشیِ حق کسی حق شناس کی رہبری میں سفر کیا کرتے تھے۔

آدمی کا ایک بڑا مسئلہ تنہائی ہے، جس کی جڑیں سماجی رشتوں سے لے کر کائنات سے انسان کے تعلقات تک پھیلی اور اُتری ہوئی ہیں۔ قلم تنہائی کے خوفناک اور المناک احساس کا تج

بہدف علاج ہے۔اسٹیٹس،شہرت،جنس اور مادی آسائشوں کا بوجھ اسی تنہائی سے نجات پانے کا وسیلہ ہیں،مگراس سے تنہائی گھٹتی نہیں۔اگر گھٹ سکتی تو اُمرااور عیش پسند لوگ خودکشی نہ کیا کرتے۔ انسان کے احساس تنہائی کو ابھی پوری طرح سمجھا ہی نہیں گیا۔اسے سماجی،معاشی یا زیادہ سے زیادہ نفسیاتی مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور نفسیاتی مسئلے کے پیچھے بھی سماجی اور معاشی عواملِ کارفرما سمجھے گئے ہیں۔حالاں کہ تنہائی ایک خالص انسانی اور روحانی مسئلہ ہے۔دولت کے ڈھیر لگانے،شہرت کی چکاچوند جگانے یا جنسی لذت میں ڈوب جانے کا مطلب کاغذ کے محل اُسارنا ہے جو ہوائے زماں کے بس پہلے تھپیڑے سے رزق ہوا ہو جاتے ہیں اور تنہائی گزیدہ آدمی خوابوں کے ٹوٹنے پر مزید تنہا اور دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔اگر مادی اَشیا،انسان کی تنہائی کا مداوا ہوتیں تو یہ کائنات کیا کم تھی،جس میں پھولوں سے لے کر کہکشاؤں تک ہزاروں خوبصورت چیزیں موجود ہیں۔انسان کی اَزلی تنہائی کا واحِد علاج اس کائنات کے متوازی ایک اپنی کائنات تعمیر کرنے میں مُضمَر ہے۔قلم جب انسان کو دو جہاں سے بے نیاز کرتا ہے تو دراصل ایک نئے جہاں کی تخلیق سے حاصل ہونیوالی سیر چشمی عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

کہنا سننا

کہنا آسان اور سننا مشکل، اس لیے کہنے والوں کا ایک غول بیابانی اور سننے والے بس مٹھی بھر۔ کہنے والے ہر قدم پر موجود و سرگرداں اور سننے والوں کو چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ کہنے والے اس زعم میں گرفتار کہ ان کے پاس اقوال و فرمودات کی فراوانی، ان کا ہر حرف سونے میں تولنے کے قابل، ہر لفظ تاریخ کے سنہری اوراق میں محفوظ کر لینے کا مستحق! اور سننے والوں کا دعویٰ کہ سننے کے لائق فقط چند باتیں، اور سن کر طاق دل میں سجا لینے کے قابل تو بس دو ایک باتیں۔ ورنہ ایک شور ہے، سنی سنائی باتوں کا، ایک ہی بات کو گھما پھرا کر کہنے کا، بے سوچے سمجھے بولتے چلے جانے کا!

کہنے والے نو دولتیوں کی طرح جا و بے جا نمائش کے دلدادہ اور دوسروں کو مرعوب کرنے میں ہمہ دم کوشاں اور بے حال۔ مگر سننے والے شانت اور بے نیاز۔

کہنے والے اس گمان میں کہ انھیں سنا جا رہا ہے۔ سننے والے اس دھیان میں کیا کلمہ اور کیا قول سننے کے قابل! کہنے والے اپنے زعم اور گمان سے باہر نہیں آتے، اس ڈر سے کہ اگر زعم و گمان کا یہ طلسم ٹوٹ گیا تو ان کے ہونٹوں پر مہر سکوت لگ جائے گی اور سب کہنے والے سکوت کو کلام کے درجے تک لے جانے کا ظرف رکھتے ہیں نہ حوصلہ اور جو اس ظرف و حوصلہ سے محروم ہوتے ہیں وہ چپ ہو جائیں تو ان کا اندر زخ ہو جاتا ہے۔ چپ رہنے کا حوصلہ چند ایک میں، اپنی خاموشی کو صدا بنانے کی صلاحیت دو ایک میں اور سکوت کو پر لطف بنانے کا ملکہ تو کسی کسی میں ہوتا

ہے۔ آخر الذکر عمل کیمیا گری ہے۔ ہلاہل کو قند بنانے کا فعل، وحشی کو سدھانے اور بے ضرر بنانے کا معجزہ ہے مگر جب یہ معجزہ رونما ہو جاتا ہے تو آدمی کے کانوں کے پٹ باہر کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف بھی کھل جاتے ہیں۔ وہ اجنبی مگر شیریں "لفظ" سنائی دینے لگتے ہیں جو کبھی کہے نہیں گئے، جو محتاجِ صدا نہیں رہے......! اور اندر کی صدائیں سننے والے ہی یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت اور جرأت پیدا کرتے ہیں کہ کیا اور کس کو سننا چاہیے، کب سننے کے بعد لب کشا ہونا چاہیے اور کب فقط سکوت اختیار کرنا چاہیے۔

یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ جو خاموش ہے، وہ سن رہا ہے۔ کہنے والا دوسروں سے بڑھ کر اس غلط فہمی کا شکار ہے۔ اسی وجہ سے رموز و اوقاف کا خیال رکھے بغیر بے تکان بولے چلا جاتا ہے۔ سکوت، سماعت کی ضرورت ہو تو ہو، شرط نہیں! کچھ لوگ اس لیے خاموش ہوتے ہیں کہ کہنے والے کا بھانڈا سرِ عام پھوڑنا نہیں چاہتے، بعض اس لیے چپ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کو جو کچھ تھا، وہ کہہ چکے ہوتے ہیں اور چند ایک اس لیے لب بستہ ہوتے ہیں کہ انھیں کہنا نہیں آتا۔

کہنے میں طاقت کی سرشاری ہے مگر سننے میں اختیار کی شوریدہ سری! کہنے والے کی نظر میں سامع خالی ہاتھ اور وہ ایک دیالو۔ سننے والے بھیڑیں اور وہ ان کا گڈریا۔ وہ ایک کلک گوہریں اور سامعین مثل خالی صفحے کے۔ مگر کہنے والا نہیں جانتا کہ جس طاقت کا نشہ اسے بے تکان بولے چلے جانے کا جنون دیتا ہے، وہ اس وقت تک بے معنی اور محض جھوٹا گمان ہے، جب تک سننے والا اسے طاقت نہیں کہتا۔ معنی دینے کے اختیارات سننے والے کے پاس ہیں۔ سننے والے چاہیں تو طاقت کے عقب میں مضمر کسی ناطاقتی کو بے نقاب کر دیں اور چاہیں تو خاموشی کو گفتار اور گفتار کو لغویات قرار دے ڈالیں۔ یوں اصل دیالو سننے والا اور کہنے والا اس کا محتاج ہے۔

کہنے والا پابند مگر سننے والا آزاد! کہنے والا کہہ چکنے کے بعد اپنے کہے کا پابند اور ذمہ دار، اعزاز کا مستحق یا احتساب کا سزاوار۔ مگر سننے والا آزاد! سننے سے پہلے بھی، سننے کے بعد بھی اور سننے کے دوران میں بھی! اور مزے کی بات یہ کہ کہنے والے کی جزا و سزا کا فیصلہ سننے والے پر منحصر!

کہنے والے کو ہر قدم پر احساس کہ جو کہنا چاہ رہا ہے، نہیں کہہ پا رہا ہے۔ اس کے خیال کی برق، لفظ کی گرفت سے پھسل پھسل جاتی ہے۔ اس کے احساس کا بہاؤ جملوں کے اندر ہی کہیں ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک پیہم تشنگی کہنے والے کا مقدر، مگر سننے کی تقدیر سیرابی۔ خیال کی جو برقی رو

کہنے میں نہیں سما پاتی ہے، سننا اسے گرفت میں لے لیتا ہے۔ احساس کے جو ریزے جملوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں سننا انھیں یکجا کر لیتا ہے۔ کہنے کے تمام زخموں......اور خالی جگہوں کو سننا بھرتا ہے مگر سننا ایسا چاکر نہیں ہے جو کہنے کی خدمت میں دست بستہ کھڑا رہتا ہے اور فقط اس کے اشارے پر ہی حرکت میں آتا ہو اور صرف اس سمت میں سفر پیما ہوتا ہے جس کا اذن اسے کہنے سے ملا ہو! کہنے کی سرشت میں آمریت اور سننے کو اپنا بندہ بے دام بنانے کی بے قابو خواہش ہے مگر سننے کا مزاج جمہوری ہے۔ اپنی صوابدید اور ارادے کو بروئے کار لانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ چناں چہ یہ ان انجانی سمتوں میں بھی بے دھڑک پہنچ جاتا ہے جس کی ''طرف'' جانے سے کہنے نے سختی سے منع کر رکھا ہوتا ہے، یا ان پر بھاری تالے ڈال رکھے ہوتے ہیں۔

سننا کہنے کے اعلان کردہ خطرات اور عائد کردہ تعزیرات سے شمہ بھر خوفزدہ نہیں ہوتا۔

جس کہنے کو سننا نصیب نہ ہو، اس کہنے کی بدنصیبی دیدنی ہوتی ہے...... ہر کہنے کے اندر سنے جانے کی طلب اسی طرح پوشیدہ ہوتی ہے جس طرح محبوب کے اندر چاہے جانے اور دیوی کے دل میں پوجے جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ کوئی اظہار بے نیاز سماعت نہیں۔ سنے جانے کی تمنا ہی کہنے والے کا اعتماد ہے اگر ایسا ہے تو سننا اوّل اور کہنا بعد از اوّل!

سننا ایک آرٹ ہے اور آرٹ شے اور لاشے پر جمالیاتی تصرف کا نام ہے۔ سننا کہے اور ان کہے دونوں پر جمالیاتی تصرف کرتا ہے: انھیں اپنی کٹھالی میں ڈالتا، پگھلاتا اور انھیں کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ سنے جانے کے بعد ''کہنے'' کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ سننا صبا کے مانند کہنے کی کلی کو مس کر کے پھول بنا دیتا ہے اور پھر اس کی خوشبو کو چہار سو بکھرنے کا موقع عطا کرتا ہے۔ جس کہنے کو سننے کا حدت بھرا لمس نہ ملے، اس پر مردنی طاری ہونے لگتی ہے۔ سننا مسیحائی کا عمل ہے: کہنے، کہنے والے، سننے والے سب کے لیے۔ سننے کا لمس جب کہنے کے بدن کی پور پور میں سرایت کرتا ہے اور ایک میٹھی نغمگی سے اسے شرابور کر دیتا ہے تو خود سننے (اور سننے والے) کے وجود میں بھی ایک شیریں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ دونوں کے زخم بیک وقت بھرنے لگتے ہیں۔

ضروری نہیں کہ جس اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اسی توجہ سے سنا بھی جائے! نہ یہ لازم ہے کہ جو کچھ کہا جائے، وہ سارے کا سارا بے کم و کاست سنا بھی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا کی تاریخ ہی مختلف ہوتی۔ انسانی تاریخ پسماندہ شہر کی سڑکوں کی طرح جگہ جگہ سے ادھڑی اور ٹوٹی

ہوئی......اور بے ربط ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ پورے کا پورا سنا نہیں گیا۔ کبھی بہت سے اہم مقامات پر کان بند رکھے گئے ہیں، کبھی بہت سے کہنے کو سننے کے شایان نہیں سمجھا گیا اور کبھی سن کر بہت جلد بھلا دیا گیا ہے۔

عام خیال ہے کہ کہنا اور سننا کاغذ کے دو اطراف ہیں۔ اگر کہیں کہنا موجود ہے تو سامع بھی ہے، کوئی منظر ہے تو وہیں ناظر بھی موجود ہے مگر واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ اکثر کہنا جنگل کے مور کے رقص کی طرح ہوتا ہے جسے وہ خود ہی دیکھتا اور خود ہی حظ اٹھاتا ہے۔ کوئی کہنا، سنے جانے کی تمنا سے خالی نہیں، مگر ہر کہے کی تقدیر میں سنا جانا نہیں......تاہم کبھی کہنا، خطیب کی تقریر کی طرح فی الفور سنا جاتا اور اثر پیدا کرتا ہے اور کبھی سالوں، قرنوں بعد کسی کہنے کو سننا نصیب ہوتا ہے......تاریخ فقط کہنے سے نہیں بلکہ سنے جانے کے بعد بنتی ہے۔ جہاں صرف کہا جا رہا ہو اور سنا نہ جا رہا ہو وہاں کانوں کے پردے پھاڑ ڈالنے والا شور تو ہو سکتا ہے۔ تاریخ ہرگز نہیں!!!

کائنات بوڑھی نہیں ہوتی

آج جب میں رات کو عبور کر کے صبح تک پہنچا اور میری خوابیدہ آنکھیں اندر کے منتشر عالم سے باہر کی طرف اٹھیں تو ان کی تھکن اور بڑھ گئی۔ سب کچھ پرانا اور بوسیدہ لگا۔ سورج بوڑھا اور خون کی کمی کا شکار محسوس ہوا جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے دن کے پہاڑ پر ہانپتے ہوئے چڑھ رہا تھا۔ ہوا کی کمر بھی نقاہت اور عمر کی زیادتی سے جھکی ہوئی تھی اور اس کے سانسوں میں عہد کہولت کی مخصوص باس رس بس چکی تھی۔ درخت بھی نڈھال تھے اور ان پر بیٹھے پرندے مسلسل جمائیاں لے رہے تھے اور سب لوگوں کے چہروں پر کھنڈر عمارتوں کی سی ٹوٹتی بکھرتی کہنگی مسلط تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ ساری کائنات ایک بڑا غار ہے جس میں یہاں سے وہاں تک یک ملگجی پر ہیبت فضا کا راج ہے اور جس میں جا بجا جالے لٹکے ہیں اور جو آسیب زدہ ہے۔ میں تازہ ہوا کے لیے لمبے اور گہرے سانس کھینچتا ہوں مگر میرے سینے کی حبس زدگی اور بڑھ جاتی ہے اور لگتا ہے کہ باہر کا غار میرے اندر کھنچا چلا آیا ہو اور پھر دفعتاً ایک کاٹتی ہوئی لہر میرے اندر اٹھتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے، میں اس غار میں قید ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان کی موہوم لکیر پوری طرح روشن ہو جاتی ہے اور محض ایک قدم کا فاصلہ لگتی ہے۔ میرے لیے یہ گھڑی بہت قیمتی اور نادر ہوتی ہے کہ میں اس گھڑی پوری طرح بیدار ہو جاتا ہوں۔ ہر چند اس لمحے میں ایک دہشت سمائی ہوتی ہے، مگر شاید یہی دہشت میرے اعصاب اور میرے احساسات پر آکاس بیل کی طرح لپٹی اور ان کا خون چوستی، غنودگی کو ایک پل میں جھٹک ڈالتی ہے۔ مجھے موت اور زندگی کی درمیانی

لکیران دودھیا نقطوں کا سلسلہ دکھاتی دیتی ہے جو روشن اور تاریک جہانوں کی سرحدی لائن ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میری قید کی زنجیر کی ایک کڑی ٹوٹ جاتی ہے اور یہ بات مجھے اپنے اختیار میں محسوس ہوتی ہے کہ میں سرحدی لائن کے اس طرف یا اس طرف قدم رکھوں۔ چاہوں تو فقط ایک جست بھر کر تاریکیِ عدم میں خود کو تحلیل کرلوں اور نہ صرف ''خود'' سے نجات، بلکہ نجات کے تصور سے بھی نجات پالوں۔ اختیار کا یہ احساس میرے لیے ایک قوت بخش معجون کا کام کرتا ہے اور میرے ذہن میں یہ علم روشن ہوجاتا ہے کہ گھنے تاریک جہان کی طرف بالآخر اور بہر طور مجھے جانا ہے اور کبھی کو جانا ہے اور قید در قید کے احساس سے بہرکیف رہائی مل جانی ہے۔ اس لیے اپنی توانائی کو اس سمت کے خوف یا اس سمت کے ارادی سفر میں ضائع کر ڈالنا سراسر حماقت ہے اور فطرت بہرحال اتنی مہربان نہیں ہے کہ وہ اس حماقت کو معاف کر دے!

اب یاد آنے لگتا ہے کہ مجھے اپنے اندر اور باہر کے پرانے مہیب غار کی موجودگی کا احساس وقفے وقفے سے ہوتا رہا ہے۔ میرے بدن پر نصب پانچوں کھڑکیوں پر گرد جم جاتی ہے اور جالے بن جاتے ہیں اور پھر سب کچھ کہنہ اور گرد آلود ہوجاتا ہے۔ اس خیال سے میری قید کی زنجیر کی ایک اور کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ میرے لیے یہ احساس پر مسرت ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس واحد نوع کا فرد میں ہی ہوں جو موجود کے استبداد کا سامنا کرنے کے بیسیوں گر جانتا ہے۔ کبھی وہ موجود کی تہ میں اتر جاتا ہے اور یوں کھردری بالائی سطح کے نیچے جو ملائمت ہے اسے مس کرلیتا ہے اور کبھی موجود سے ماورا ہوجاتا ہے اور اپنا ایک موجود تخلیق کرلیتا ہے جو اس کی خوشیوں اور امیدوں کا علمبردار ہوتا ہے اور کبھی موجود کی چھوٹی سی گیند بنا کر اس کا تماشا کرتا اور لطف اندروز ہوتا ہے۔ اور کبھی موجود کی ضرورت ہی سے یکسر بے نیاز ہوجاتا ہے...... یہ خیالات میرے حواس کی کھڑکیوں پر پڑی گرد کو رفتہ رفتہ ہٹاتے جاتے ہیں اور غار کے جالے بھی صاف ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ ہوا کے سانس بھی مہکنے لگتے ہیں اور سورج کا چہرہ بھی تمتمانے لگتا ہے اور میں سوچتا ہوں، کائنات بوڑھی نہیں ہوتی، میں ہی مضمحل ہوجاتا ہوں۔ یہ کائنات تو حد درجہ خلیق اور میری غمگسار ہے اور بہت ہمت والی ہے۔ یہ اپنے دکھ کو کسی لمحے اور کسی شکل میں ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ اس پر جو کبھی کبھی اضمحلال طاری ہوتا ہے وہ دراصل میرے دکھ کی وجہ سے ہے۔ سانس میرا پھولتا ہے تو قدم اس کے ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اشک میری آنکھوں سے گرتے

ہیں تو چہرہ اس کا بھیگ جاتا ہے مجھے خیال آتا ہے اگر دوبارہ کبھی Big Bang ہوا اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح، آوارہ اور برباد حالت میں اڑے تو ایسا اس لیے ہوگا کہ کائنات کا باطن انسانوں کے دکھوں سے بھر کر چیخ جائے گا۔ حشر دراصل ہمارے دکھوں پر کائنات کا ماتم ہوگا۔ مگر یہ کائنات بہت بڑی ہے اور اس کا ظرف اس سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے ہمارے دل کے داغوں سے اس کا سینہ شاید ہی پھٹے! اس بات کا امکان اس لیے بھی ہے کہ کائنات داغ کو نقطۂ نور بنانے کی بے مثال صلاحیت رکھتی ہے اور اس جہان میں انسانوں کے عظیم اور ابدی دکھوں کے باوجود یہ جو روشنی اور تازگی نظر آتی ہے، اسی تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے ہے۔ کائنات نئی نویلی دلھن کی طرح ہے جو ہر روز سنگھار کرتی ہے اور اس کا ہر دن جو پہلے سے زیادہ چمکیلا اور نکھرا ہوا اور تازہ تازہ استری شدہ سفید کاٹن کے سوٹ کی طرح ہوتا ہے تو اس لیے کہ یہ تاریکی کو روشنی میں بدلنا اور اپنی اس کامیابی پر مسکرانا جانتی ہے۔

یہ ننھے ننھے خیالات میری ذات کی منڈیر پر حسین پرندوں کی طرح برابر اترتے جاتے ہیں اور میں صبح کے اولین لمحوں میں جس بیزار کن کیفیت میں گرفتار تھا، اس کا استبداد کم ہونے لگتا ہے۔ زنجیر کی سب کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں: آدمی کی بڑی بڑی خوشیاں ننے ننھے خیالات سے کس قدر جڑی ہوئی ہیں! آدمی چاہے تو اسی ننھی مخلوق سے تمام بڑے سانحوں اور المیوں کی فوج ظفر موج کے دانت کھٹے کر سکتا ہے۔ یزداں تک کو شکار کر سکتا ہے ۔ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہر بڑا دکھ کترنوں سے بنی ہوئی گیند ہوتا ہے۔ ایک ننھے سے خیال کی مدد سے ایک کترن ہاتھ میں آجائے تو ساری گیند کھل جاتی ہے اور آدمی دکھ اور اس کی ہیبت کذائی پر ہنس سکتا ہے۔ بس ان خیالات کی آمد کا راستہ کھلا رہنا چاہیے۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو دراصل یہ راستہ بند تھا۔ میں رکا ہوا تھا اور میرے ساتھ سب کچھ Still ہو گیا تھا۔ اور اب جبکہ میرے راستے کی رکاوٹیں دور ہو گئی تھیں اور میری روانی بحال ہو چکی تھی تو ہر شے نے اپنی مخصوص رفتار پکڑ لی تھی۔ ایک مہربان چہرہ، یہاں وہاں سب جگہ نظر آرہا تھا، جس کی پر التفات نظروں کی زد پر میں کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

جھوٹ سچ

خدا جھوٹ نہ بلوائے ،جھوٹ اور سچ کے بیچ ایک موہوم سی لکیر ہے......کیا سمجھے ......دھندلی، ملگجی لکیر دونوں کو جدا کرتی ہے۔نہیں جناب ،اگر ایسا ہوتا تو دنیا سخت بیزار ہوتی ،دنیا کی ساری ہما ہمی ،تُو تُو مَیں مَیں اور میں نہ مانوں یعنی زبانی کلامی دنگے فساد اور مبالغے سے ہے ۔اگر سچ اور جھوٹ کا فرق ،دن اور رات کی طرح واضح ہوتا تو سوچیے کہ مناظروں ،مناقشوں،مباحثوں،کلامیوں، یہاں تک کہ قصے کہانیوں اور شعروشاعری کے بازار میں کس قدر مندی ہوتی......لوگ کم بولتے ،زیادہ سنتے اور اس سے زیادہ سکوت سخن شناس کے ساتھ یقین کر لیتے''۔نہیں صاحب،تصویر کا یہ رخ بھی دیکھیے !''

''ارے، یہ کیا،آپ نے اس پہلو سے تو غور ہی نہیں کیا!''اس طرح کی بحث اور اس طرز کی تکرار کی لذت سے زبانِ مقرر محروم اور زبانِ قلم ،نا آشنائے محض ہوتی ۔دنیا امن کا گہوارہ ہوتی کہ نہیں ،وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے ،مگر دوستی دشمنی ،نفرت محبت ،دائیں اور بائیں کی تفریق روزِ روشن کی طرح ہوتی......سانپ پلوں میں ہوتے ،آستینوں میں نہ ہوتے !

جھوٹ اور سچ کے بیچ ،لکیر کی موجودگی سے کوئی سخت جھوٹا شخص ہی انکار کر سکتا ہے ۔اگرچہ دنیا میں ایسے جھوٹوں کی کمی نہیں اور انھی کے بھائی بند منصب ہائے جلیلہ پر فائز ہیں ،اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی مسند نشینی میں جھوٹ کا ہاتھ نہیں ،اور ان کی مسند کی کرشمہ سازی جھوٹ اور سچ کی درمیانی لکیر کو چھپا یا مٹا سکتی ہے !بہر کیف اسی شے کو چھپایا یا مٹایا جا سکتا ہے جو نہ صرف

موجود ہے بلکہ جس کی موجودگی خطرے، خسارے اور ہزیمت کا باعث ہو۔ قصہ سارا یہ ہے کہ جھوٹ اور سچ کے بیچ کی لکیر ملگجی ہے...... ہر ملگجی شے ہمارے اندر گمان پیدا کرتی، ہمارے خوابیدہ تخیل کو بیدار کرتی اور ہمیں اساطیر سے لے کر طرح طرح کے حیلے بہانے تراشنے تک کی تحریک دیتی ہے۔ جھٹپٹا اور ملگجا پن جادو، شاعری، داستاں سرائی سے لے کر ہمارے جھوٹ نما سچ اور سچ نما جھوٹ تک کا ذمے دار ہے۔ جھوٹ اور سچ کے درمیان کی ملگجی لکیر نے اکثر سادہ اور نیک دل لوگوں کو اس گمان میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اس کا کام دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا ہے۔ آپ ہی ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر، سچ کہیے کہ جہاں دودھ اور پانی کے بیچ کوئی دیوار نہ ہو، بس ایک موہوم سا منحنی سا خط ہو، وہاں دونوں کے شیر و شکر ہونے کو روکا جا سکتا ہے! دنیا میں بہت سے لوگ اپنے پاس جادو کی چھڑی کے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی مدد سے سچ کے دودھ اور جھوٹ کے پانی کو بس ایک اشارے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل اپنی جادو بیانی سے اپنے جھوٹ کو دوسروں کا سچ ثابت کرتے ہیں۔ یہ جادو دبیانی ہر اس شخص کے پاس ہے جسے علم ہے کہ جھوٹ اور سچ کے بیچ کوئی خطِ امتیاز نہیں، ایک سرمئی سا منطقہ ہے: اور جسے یہ بھی خبر ہے کہ اس منطقے کی ترکیب میں چٹکی بھر سچ اور مٹھی بھر جھوٹ شامل ہے۔ ہمارے مباحثے، مناظرے، ہمارے آوارہ تخیل کی چہل قدمی کا دوسرا نام ہیں۔ چناں چہ یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں کہ آدمی کے جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچائی ہے، اس کے سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ شامل ہے۔

کسی سیانے کا قول ہے کہ جھوٹ وہی شخص بولتا ہے جو سچ کہنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس قول کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سچ بھی وہی شخص بول سکتا ہے جو جھوٹ بولنے کے فن میں طاق ہو۔ اسی قول کو مزید آگے بڑھائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ جھوٹ اور سچ کا تعلق آدمی سے اس قدر نہیں، جس قدر آدمی کی قوتِ اظہار سے ہے۔ لہٰذا عجب نہیں کہ کچھ دل کے سچے اس لیے جھوٹے قرار پاتے ہیں کہ ان کا حرفِ بیاں، ان کے حرفِ مدعا کا ساتھ نہیں دیتا اور کچھ نیت کے کھوٹے حق گوئی و بیباکی میں اس لیے طرم خاں کا لقب پانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ ان کی دسترس میں اظہار کے گوناگوں وسائل ہوتے ہیں ...... سیاست و صارفیت میں اسی لیے ابلاغ کے وسائل کو خریدنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی ہے۔

جھوٹا شخص اپنے دل کی سچائی کے ساتھ اس یقین کا حامل ہوتا ہے کہ اگر جھوٹ گھڑا

جاسکتا ہے تو سچ کیوں نہیں ......بس گھڑنے کی مہارت درکار ہے...... جب ایک دفعہ یہ مہارت حاصل ہوجاتی ہے تو پھر جس سہولت سے جھوٹ گھڑا جاتا ہے، اسی آسانی سے سچ بھی ڈھال لیا جاتا ہے۔

چند سَر پھرے فلسفیوں کو چھوڑ کر دنیا جھوٹ اور سچ کی قدر و قیمت ان کے اَثر میں دیکھتی ہے۔ گزرے وقتوں میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ صرف سچ میں ہی اَثر ہوتا ہے، جو وقتی طور پر کڑوا مگر انجام کار میٹھا ہوتا ہے۔ چناں چہ لوگ میٹھے اَثر کی توقع میں سچ کے کڑوے گھونٹ خوشی خوشی بھر لیا کرتے تھے۔ مگر موجودہ زمانے کی چند اہم ترین دریافتوں میں سے ایک دریافت یہ ہے کہ سچ کی طرح جھوٹ بھی میٹھا اور کڑوا ہوسکتا ہے ......یہی نہیں، جھوٹ کی کڑواہٹ یا مٹھاس کو حسب ضرورت سماجی یا مالی اثر کے لیے استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ وہ زمانہ لَد گیا جب جھوٹ کو سچ کے لبادے میں پیش کرنے یا سچ خریدنے کی کوشش ہوتی تھی۔ اب زمانہ اس طرح کے کشٹ نہیں اٹھاتا: اب جھوٹ سچ دونوں گھڑ لیے جاتے ہیں اور انھیں موقع محل کی مناسبت سے استعمال کر کے، حسب دل خواہ نتائج حاصل کر لیے جاتے ہیں!!

☆☆☆

سفر جاری رکھنا ہے!

میں یہ سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں!

سفر شروع کرنے کے لیے ایک ہاتھ میں رختِ سفر تو دوسرے میں سمت سفر کا چراغ ہونا ضروری ہے اور سفر جاری رکھنے کے لیے لازم ہے کہ دل، رختِ سفر کے کھونے کے خوف سے آزاد مگر سمتِ سفر کے چراغ کو ہر حال میں جلائے رکھنے کی تمنا سے سرشار ہو۔ رختِ سفر کے بغیر سفر ممکن مگر سمت سفر کے بنا سفر مشقت ہے۔ اگر مسافر کا من ہر پل سامانِ سفر میں اٹکا رہے تو اس کا حال بار بردار جانور کا سا ہوتا ہے۔ جسے سفر سے نہیں اسبابِ سفر کو ڈھونے سے دلچسپی ہوتی ہے اور جو اپنے من سے نہیں اوروں کے حکم اور خوف سے فاصلوں کو ناپا کرتا ہے۔

یہ سفر شروع کرنے سے پہلے میرے پاس کچھ اسباب تو تھا مگر سمت سفر کا کوئی جگنو تھا نہ چراغ! اصل میں مجھے اس کا کوئی موقع ہی نہیں دیا گیا تھا اور شاید یہ اچھا ہی ہوا! اگر روانگی سے پہلے میرے ہاتھ میں کوئی ایسا کارڈ تھما دیا جاتا جس پر نشانِ منزل جلی حروف میں لکھا ہوتا تو اغلب ہے کہ میں سفر ہی سے انکار کر دیتا، اس لیے نہیں کہ منزل کٹھن تھی، میں سہل پسند اور اسبابِ سفر معمولی بلکہ اس لیے کہ انکار کا بیج میری سرشت میں ہے اور انکار کسی منطق کا پابند بالعموم نہیں ہوتا، اسے دلچسپی ہوتی ہے اپنے بے باکانہ اظہار سے۔ مگر اب جب کہ میں بیچ راستے میں ہوں تو اس سفر کو ترک کرنا آسان نہیں ہے۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ میرے رکنے سے آسماں کی گردش تھمے گی نہ میرے ہمراہ چلنے والوں کا یہ کارواں راستہ بھولے گا۔ میں اس زعم میں بھی نہیں ہوں کہ میرے اس سفر پر

امنِ عالم کا انحصار ہے اور نہ مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ میں رکوں گا تو ملک میں حقیقی جمہوریت لانے کی کوششوں کو کوئی دھچکا لگے گا۔ اس سب کے باوجود میں سفر کے اس سلسلے کو روک نہیں سکتا، رو کنے کے اختیار کے باوجود! تاہم سفر کو گوارا بنانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی جوازِ سفر ڈھونڈ نا پڑا اور کسی نہ کسی چراغ کو ہاتھ میں رکھنا پڑا ہے۔ ویسے بغیر جواز کے بھی سفر جاری رکھا جا سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں مسافروں کے اندوختے میں جواز نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ بغیر جواز کے مسافر یا تو مشین کے مانند ہوتا ہے یا جانور کی طرح...... ہر حس اور خبر سے یکسر عاری یا پھر اندھے جذبات کی پوٹ!

سفر کو جاری رکھنے کے لیے جواز ضروری ہے، مگر کوئی ایک جواز نہیں! صرف ایک جواز سے بندھ کر آدمی کی رفتار ہی سست نہیں ہوتی، اس پر بہت سی راہیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ "واحد جواز" تو بھاری پتھر ہے، جسے فقط ایک سمت میں تھوڑی دور تک ہی گھسیٹا جا سکتا ہے۔ چناں چہ اکثر لوگ اس پر مشقت سفر سے تنگ آ کر اس "پتھر" سے اپنا سر پھوڑ لیتے یا اپنے پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے پاس اس سفر کے لیے کئی جواز اور میری زنبیل میں ایک سے زائد چراغ ہیں اور یہ جواز سکوں کی طرح ہیں۔ ہر سکے کی قیمت اور محلِ استعمال الگ الگ ہے۔ کسی مقام پر کوئی ایک معمولی سکہ کام دے جاتا ہے تو کسی موقع پر کوئی بڑا "نوٹ" صرف کیے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ آدمی کی جیب میں جتنی "ریزگاری" ہوگی وہ اتنے ہی زیادہ راستوں سے آشنا اور نظاروں سے لطف اٹھا سکے گا اور آپ جانتے ہیں کہ "گھاٹ گھاٹ کا سفر" کرنے والوں کے کاندھے اور ہاتھ غیر ضروری بوجھ سے آزاد ہوتے ہیں اور جو لوگ جیب میں صرف ایک بڑا "نوٹ" رکھتے ہیں، انھیں یا تو راستے میں ہی اتار دیا جاتا ہے یا پھر وہ ایک ہی طویل یک سمتی سفر کر سکتے ہیں اور طویل یک سمتی سفر سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں!

اس سفر میں میرے پاس جو دیپ ہیں، ان میں سے کچھ میں نے اوروں کے چراغوں سے اور کچھ خود جلائے ہیں۔ خود چراغ روشن کرنے کے لیے کبھی خونِ جگر جلانا پڑتا ہے، کبھی لہو رونا اور بعض اوقات اپنے پورے وجود کو بھسم کرنا پڑتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ روشنی ہر جگہ روشنی ہے، مگر مجھے اصرار ہے کہ روشنی روشنی میں فرق ہے۔ دوسروں سے حاصل کی گئی روشنی، اپنے خون یا خونِ جگر سے نکلنے والی روشنی اور اپنے پورے وجود کی راکھ سے پھوٹنے والی روشنی میں بہت فرق ہے۔ نوعیت کا بھی اور درجے کا بھی! مستعار روشنی صرف راستہ دکھاتی ہے، خونِ جگر سے حاصل ہونے والی روشنی راستے پر چلنے کا اعتماد بخشتی ہے، مگر پورے وجود کی بھوبھل سے طلوع ہونے والا

نور نئے راستے تخلیق کرتا ہے اور یہ راستے زمینی بھی ہوتے ہیں اور زمانی بھی، مکانی بھی اور لامکانی بھی......زمیں سے لے کر افق تک اور افق سے آگے کہکشاؤں تک! مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے وجود کو پھونک ڈالنے کے نایاب تجربے سے نہیں گزرا۔اسی لیے میرا سفر یا دوسروں کے دکھائے گئے راستوں پر ہے یا ایسے راستوں پر جو پہلے سے موجود تو تھے مگر سوجھے مجھے ہیں، اسی بنا پر میری رفتار میں کہیں لغزش تو نہیں، اعتماد اور وقار ہے! مگر اڑان ایسی کیفیت نہیں ہے۔

اس سفر میں مجھے قسم قسم کے حریفوں سے سابقہ رہتا ہے۔ ہر حریف سے نمٹنے کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔اگر نہیں بھی ہوتا تو سفر کو خوشگوار بنانے کے لیے الگ طریقہ نکال لینا چاہیے۔میں نے ایک طریقہ یہ نکالا ہے کہ ان کا ذکر کم سے کم کیا جائے۔معلوم نہیں اس کا اخلاقی رتبہ کیا ہے مگر میں نے اسے عملی طور پر بہت کارآمد پایا ہے۔چوں کہ سفر کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی حریف سر نکالے یا گھات لگائے موجود ہوتا ہے، اس لیے ایک حریف کے ذکر میں گم ہونے کا مطلب دوسرے کو فراموش کرنا اور یوں اسے حملہ آور ہونے کا موقع دینا ہے، مگر میں یہاں ایک حریف کا تذکرہ کیے بنا نہیں رہ سکتا۔میں نے انسان کا سب سے بڑا مدمقابل کائنات کو پایا ہے، جی ہاں کائنات کو! آپ حیران ہوئے ہوں گے۔کائنات کے اصل دو چہرے ہیں: ایک چہرہ مادرِ مہربان کا سا اور دوسرا سخت گیر حاکم کے مانند۔مجھے اس نے نعمتوں سے بھی نوازا ہے اور اپنے سفر میں مجھے اس کے سخت گیر رخ کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔میں اس کائنات کی لامحدودیت کا احساس کر کے کئی مرتبہ سہم گیا ہوں۔میں نے خود کو ایک ایسے تنکے کے طور پر محسوس کیا ہے جو فلک گیر بگولے کی طوفانی یورش میں ڈولتا، بکھرتا کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہو! کائنات ایک بحرِ بیکراں اور میں ایک بے آسرا، بے نام بجرا ہوں۔مسافر پر یوں تو بھاری وقت آتے رہتے ہیں، مگر بے معنویت تو کوہِ گراں کی طرح ہے جو سب دیکھے بھالے راستوں کو تہس نہس ہی نہیں کرتا، ان پر آسن جما کر بیٹھ ہی رہتا ہے اور مسافر کے ضبط اور حوصلے کو برابر للکارتا بھی جاتا ہے۔ایسے میں، میں ایک نیا منتر آزماتا ہوں۔اپنے جیب و دامن کو ٹٹولتا ہوں۔آزمائش کے کسی لمحے میں کوئی سکہ تو جیب میں پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر کبھی جیب و دامن خالی ہوتے ہیں اور یہ ایک نئی آزمائش ہوتی ہے۔ایسے میں سکہ ٹکسال میں سے خود ڈھالنا پڑتا ہے۔اور میرا تجربہ ہے کہ جو سکہ آدمی اپنے اندر کی ٹکسال میں خود ڈھالتا ہے، کرنسی کی اوپن مارکیٹ میں اس کی قیمت کبھی نہیں گرتی۔وہ سدا کام دیتا ہے اور بعض اوقات تو اس کی نقل اورن

کے کام نکالنے میں مدد دے جاتی ہے۔ بے معنویت سے بچ نکلنے کے لیے میں نے جب بھی جیب ٹٹولی ہے، خالی نکلی ہے۔ سو مجھے جواز خود وضع کرنا پڑا، سکہ ڈھالنا پڑا اور چراغ جلانا پڑا ہے: بے معنویت اس لیے ہے کہ میں ہوں۔ میں نہ ہوتا تو بے معنویت نام کی کسی چیز کا وجود نہ ہوتا۔ اور میرا ہونا اس لیے نہیں کہ میں اس کا سب سے زیادہ مستحق یا مشتاق تھا۔ اگر استحقاق کو بنیاد بنایا جاتا تو سیارہ زمین خاصا ویران ہوتا، بس گنے چنے لوگ ہوتے! اور ان کے چند منتخب مشاغل ہوتے اور ان مشاغل میں سیاست کاری اور کمرشل ازم بہر حال نہ ہوتا! یہ محض اتفاق ہے کہ میں ہوں۔ میں اس لمحے، اس کمرے میں موجود ہوں، اپنی موجودگی کو رقم کرسکتا ہوں، کائنات کے مقابل اپنے بے مایہ اور بے معنی وجود کا ادراک کرسکتا ہوں۔ بے مائیگی اور بے معنویت کا احساس وہ چوزہ ہے جو میرے باطن کے بیضے سے برآمد ہوا ہے، جس کا صاف مطلب ہے کہ میرے بیضۂ باطن سے کچھ نہ کچھ پیدا ہوسکتا ہے۔ بس یہ خیال مجھے نہال کردیتا ہے۔ اور پھر پل بھر میں بے معنویت کے کوہ گراں پر ہلکی سی لرزش طاری ہوتی ہے اور پھر ایک دھماکے سے وہ فضائے بسیط میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ایک نورانی لکیر میرے اندر دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے جو مجھے یاد کراتی ہے کہ میں واقعی تخلیق کا اہل ہوں۔ جو عورت مرا ہوا بچہ پیدا کرتی ہے، وہ بھی تخلیق کے قابل بہر حال ہے۔ تکلیف دہ بات تو بانجھ ہونا ہے!

اور کبھی بانجھ ہونے کا لمحہ بھی اس سفر میں آتا ہے۔ ایسے میں لگتا ہے کہ سب سکے کھوٹے ہوچکے ہیں یا آدمی کی جیب اور ٹکسال پر مردنی کا عالم طاری ہے۔ مسافر پر یہ وقت نہایت کڑا ہوتا ہے۔ وہ خود کو ایک تاریک، بند گلی میں محصور پاتا ہے، جہاں وہ کوئی راستہ پاتا ہے نہ چراغ! ایسے میں اس کی توجہ کا مرکز اس کا وجود بن جاتا ہے جسے وہ تاریکی میں تحلیل ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔ بقا کی یہ خواہش ٹمٹماتا جگنو بن جاتی ہے اور گھپ اندھیرے میں ایک ننھا سا منور نقطہ بھی نمودار ہو جائے تو اندھیرے کے پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں۔ جگنو کی جلتی بجھتی روشنی میں مسافر اتنا تو دیکھ سکتا ہے کہ وہ وقت کے دریا کے کنارے پر صحیح سلامت موجود ہے، وہ دریا کے دھارے کا رُخ بدل نہیں سکتا، نہ سہی، دریا کی روانی کو دیکھ تو سکتا ہے اور دریا کے دوسرے کنارے کو خیال میں بھی لا سکتا ہے۔ اور جس کا خیال دوسرے کنارے تک زقند بھر سکتا ہے، اسے بند تاریک گلی سے ایک جست بھر کر باہر جانے اور سفر جاری رکھنے سے کون روک سکتا ہے!!

☆☆☆

چیونٹیاں

ان دنوں میری فکر چیونٹیوں کے طواف میں مصروف ہے۔اس عمل میں نہ صرف اندر کو شبنمی احساس میں بھگو دینے والی ایک عجب مسرت ہے بلکہ روشنی کے کئی در یچے بھی مجھے پر کھٹ سے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔اور میں اپنی کم نظری پر حیران اور متاسف ہوں کہ اب تک اس تجربے سے کیونکر محروم رہا! شاید قریب کی چیزیں ہی سب سے زیادہ دور ہوتی ہے یا شاید موت کی طرح ہر تجربے کا وقت بھی معین ہے۔بہر کیف میں چیونٹیوں کو ایک ایسے متن کے مانند پڑھ رہا ہوں، جس کی کئی سطحیں اور طرفیں ہوں۔ایک سطح کے انکشاف سے ملنے والی مسرت ابھی باسی نہیں ہوئی ہوتی کہ ایک اور پرت کا کچھ حصہ عریاں ہو کر اپنی تجلی دکھانے لگتا ہے اور ابھی میں اس جلوہ ء بے پایاں کی تاب نہیں لا پاتا کہ اس متن کی ایک اور سمت کے انداز دلبرانہ مجھے متوجہ کرنے لگتے ہیں۔میں حیرت زدہ بھی ہوں کہ ایک ننھی سی مخلوق میں اتنی تہ داری، اتنا اسرار اور اتنا جمال کیسے سمایا.....اور کہاں سے آیا!

چیونٹی ایک ننھی مگر غیر معمولی مخلوق ہے۔میرے اس بیان سے آپ کے ماتھے پر تشکیک کی جو شکن ابھری ہے وہ میں نے دیکھ لی ہے۔آپ سوچ رہے ہیں کہ بھلا ایک مورِ ناتواں غیر معمولی کیونکر؟ چوں کہ آپ صرف اسی کو عظیم اور غیر معمولی گرداننے کے عادی جو جثے یا اختیار میں غیر معمولی پھیلاؤ رکھتا ہو......جانوروں میں ہاتھی، چیزوں میں پہاڑ اور بادشاہوں میں سکندر کو عظیم خیال کرتے ہیں، مگر آپ ایک لمحے کے لیے اس طرز فکر کی عادت سے رہائی پائیں تو آپ کو چیونٹی

میں وہ سب اوصاف حسنہ بدرجہ اتم نظر آنے لگیں گے جو ایک غیر معمولی مخلوق کا نشان امتیاز ہیں۔ دنیا کا بہت سا حسن محض اس لیے ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے کہ ہم کسی مخصوص انداز فکر کے کھونٹے سے بندھے رہتے ہیں۔ بدصورت اور کریہہ مناظر سے ہمارا سامنا رہتا اور ہمارے اندر بردگی اور صحرائیت کا تسلط قائم رہتا ہے، اور یوں ہم ایک باطل اطمینان سے ''سرشار'' رہتے ہیں مگر جوں ہی اس کھونٹے سے ہم رہائی پانے میں کامیاب ہوتے ہیں، ایک بالکل نئے، تازہ پھول کے مانند کھلے، نم دار اور مہکتے عالم کو اپنا منتظر پاتے ہیں......اگر آپ ایک لمحے کے لیے عظمت کے روایتی تصور کی بھاری زنجیروں سے آزاد ہو چکے ہیں تو آپ کو یہ دیکھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ چیونٹی کے کردار میں آہنی استقلال اور مزاج میں رشیوں منیوں کی سی متانت ہے۔ چیونٹی اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کا سامنا خندہ پیشانی سے کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتی ہے۔ تاہم رکاوٹ سے بھڑنے کے بجائے اس سے بچ کر چلنے کی قائل ہے، خواہ سفر طویل ہی کیوں نہ ہو جائے اور پاؤں میں کتنے چھالے ہی کیوں نہ پڑ جائیں۔ ظاہر ہے یہ ایک جنگی حکمت عملی بھی ہے اور ایک پورا فلسفہ زندگی بھی! چیونٹی جانتی ہے کہ ٹکرانے کا مطلب اپنے قیمتی وقت اور ننھی سی جان کو ضائع کرنا ہے جبکہ اسے ہر حال میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ دنیا کے حریت پسندروں کو چیونٹی کی اسی جنگی چال میں اور ہمارے نصاب سازوں کو چیونٹی کے فلسفہ حیات میں اپنے مطلب کا بہت کچھ مل سکتا ہے۔

ہم چیونٹی کو معمولی، حقیر اور بے مایہ اس لیے بھی سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے سوا کسی اور کے شرف کو تسلیم کرنا ہی نہیں چاہتے۔ کسی اور کی برتری کی ابس ایک جھلک ہی سے ہماری افضلیت کو خطرات لاحق ہونے لگتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہم ایک ننھی سے مخلوق سے بھی کس قدر خوفزدہ ہیں۔ اور شاید اس خوف ہی کے تحت ہم اس کمزور جان کو بے دریغ پاؤں تلے کچلے چلے جاتے ہیں۔ جانے کیوں تہذیبی ارتقا کے اوّلین مراحل ہی میں یہ بات انسان کے ذہن میں سما گئی تھی کہ کائنات کے اقتدار میں کوئی اور مخلوق اس کی شریک نہیں!......اس نے دنیا کی جو تاریخ بنائی اور جو تاریخ لکھی ہے، دونوں میں اپنی برتری کے ثبات کو مقدم رکھا ہے ذرا سوچئے اس دنیا کی تاریخ اگر چیونٹیاں لکھتیں تو یہ تاریخ کیسی ہوتی! اگرچہ اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہنا محال ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اپنے اندر موجود اپنے ہی بت کو خود اپنے ہاتھوں گرا کر کسی اور کو اس کی جگہ نہیں

دینا چاہتا اور اس کی آنکھ سے دنیا کو نہیں دیکھنا چاہتا، تاہم اتنا قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے کہ چیونٹیوں کی لکھی گئی تاریخ میں کوئی ہیرو، کوئی سورما اور کوئی نائٹ نہ ہوتا! اور ہم ان کے بغیر تاریخ کا تصور کرنے سے بھی قاصر ہیں، مگر خیال فرمایے ہیروؤں کے بغیر تاریخ کتنی ''شاندار'' اور پرامن ہوتی! تاریخ کے اوراق پر خون کے جتنے چھینٹے اور اس دھرتی کے چہرے پر جتنے بدنما داغ ہیں، وہ تاریخی سورماؤں کی ان مہربانیوں کا نتیجہ ہیں جو وہ اکثر طبقۂ عوام پر فرمایا کرتے تھے، محض خود کو ہیرو تسلیم کروانے کے لیے۔ ہماری تاریخ نے اب تک کمزور، شکست خوردہ اور ''دلت'' پر یا تو سرے سے اپنے دروازے ہی بند رکھے ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ انھیں اپنے حاشیے پر تھوڑی سی جگہ عنایت کرنے کی فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاریخ کولھو کے بیل کی طرح کسی مرکزی ہیرو کے گرد گھومتی ہے، خود پوجا کرتی ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنے ہیرو کے آگے سیس نوائے رکھنے کی برابر تلقین کرتی ہے۔

چیونٹیوں کی لکھی گئی تاریخ میں ہیرو اس لیے ناپید ہوتا کہ ان میں خود پسندی بالکل نہیں۔ چیونٹیوں نے کبھی آئینے کے سامنے آکر اپنے ہی سراپے کے قصیدے پڑھے ہیں، نہ اوروں سے مدح سرائی کی تمنا کی ہے۔ غالباً سوائے انسان کے کوئی اور مخلوق آئینے میں یا دوسروں کے تصور میں اپنا عکس دیکھنے کے جنون میں گرفتار نہیں۔ اوّل تو وہ اپنے عکس کو آئینے میں پہچان ہی نہیں سکتیں۔ دوم اگر پہچان بھی لیں تو اپنی ہی صورت کو برابر دیکھتے چلے جانے میں انھیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ چناں چہ وہ جلد ہی اپنی شکل سے بے زار ہو کر کوئی دوسرا شغل اختیار کر لیتی ہیں۔ غور کریں تو بوریت اور بے زاری کی ایک وجہ خود کو مسلسل اپنی نظر میں رکھنا ہے۔ ایسا نہیں کہ چیونٹیاں اپنی حیاتِ یک دوزہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیتیں۔ وہ کارنامہ انجام دیتی ہیں، مگر ہماری طرح وہ اپنی چھوٹی بڑی کامیابیوں کا اعلان چیخ چیخ کر کرنے کے مرض میں گرفتار نہیں ہیں۔ ہمارے لیے کوئی کام اس وقت کارنامہ بنتا ہے جب لوگ ہمیں ہار پہنائیں، اخبار میں تصویر چھپے اور اسے دنیا میں Breaking News کے طور پر پیش کیا جائے۔ ہم جس کام پر سر اٹھا کے اور دوسروں کے سر جھکا کے نہ چل سکیں، وہ ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم اپنے کام کو اپنی نظر سے نہیں، دوسروں کے زاویہ ہائے نظر سے دیکھتے ہیں اور خوش یا ناخوش ہوتے ہیں۔ ہم اندر سے خالی ہیں اور اپنے اندر کو دوسرے یا غیر (The other) سے بھر رہے ہیں۔۔۔ اور بے خبر ہیں!

آپ پوچھیں گے کہ چیونٹیوں کا آخر کارنامہ کیا ہے؟ آپ یقیناً کارنامے کو ایسا فعل گردانیں گے، جس میں لازماً کسی کو شکست دی گئی ہو۔ مگر جناب، دنیا کی تاریخ میں ساری گڑبڑ اور سارا خون خرابہ، کارنامے کی بس اسی تعریف سے ہوا ہے۔ ہم اس آدم زاد کو ہیرو گردانتے ہیں جو نہ صرف اپنے ہم نفسوں بلکہ دوسری مخلوقات کو بھی پچھاڑنے کی مافوق الانسان قدرت رکھتا ہو! معاف کیجیے گا، چیونٹیوں مین یہ جنگجوئی بالکل نہیں۔ وہ صلح پسند ہیں، اپنے کام سے کام رکھتی ہیں ،اور اپنی راہ چلتی ہیں۔ نہ دوسروں کا راستہ کاٹتی ہیں نہ اپنی راہ ترک کرتی ہیں۔ اور مسلسل مصروفِ کار رہتی ہیں۔ انھیں پیہم مصروف اور فعال دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا، ناقابل تشریح مشن ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ چیونٹیوں کے پاس فرصت نہیں، اس لیے نہ بور ہوتی ہیں نہ بوریت کو دور کرنے کے لیے کھیل تماشے کی شیدا ہیں۔ اور یہی ان کا کارنامہ ہے۔ ایک پرامن اور صلح کل کی زندگی سے بڑھ کر کوئی کارنامہ ہو سکتا ہے!

آپ نے کبھی غور کیا، ایک دن میں ایک آدمی کتنی چیونٹیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے؟ میرے خیال میں دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں، جس کے پاؤں پر چیونٹیوں کی موت کے نشان ثبت نہ ہوں! فرض کیجیے، چیونٹیاں اس قابل ہو جائیں کہ وہ فوری سماعت کی عدالت قائم کریں اور اپنے قاتلوں کو کٹہرے میں طلب کریں تو شاید دنیا کے ہر شخص کے نام سمن جاری ہو جائیں، اور اگر چیونٹیاں اپنے مقتولین کا خوں بہا مانگیں تو شاید حضرت انسان کے تمام اثاثے کم پڑ جائیں۔ مگر سوچنے والی بات ہے کہ چیونٹیاں آخر اپنی ہم جنسوں کی اس عالمگیر قتل و غارت سے بے پروا کیوں ہیں؟ کیا اس لیے کہ وہ ناتواں ہیں؟ جی نہیں! وہ اس لیے بے نیاز ہیں کہ خود پسند اور انفرادیت پسند نہیں ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان میں کوئی بھی ممتاز اور منفرد نہیں ہے۔ چناں چہ یہ کیونٹی محمود و ایاز کے بکھیڑوں سے آگاہ ہی نہیں۔ ایک کے مرنے پر دوسری فی الفور اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ان کے لیے موت ایسا خلا نہیں جسے بھرا نہ جا سکے، ایسا گھاؤ نہیں جو مندمل نہ ہو سکے۔ یہ وہ عرفان ہے، جس کا مرتبہ اور معنویت بدھ کے نروان سے کم نہیں۔ موت کے مسئلے کا اس سے بہتر حل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم موت سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔ اور ہماری موت پر دوسرے اس لیے آہ و بکا کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں کوئی ہماری جگہ نہیں لے سکتا، جو سراسر واہمہ ہے۔ ہمارے لیے موت ان مٹ داغ ہے، مگر

چیونٹیوں کے لیے ریشمی لباس کی وہ سلوٹ ہے جو اگلے ہی لمحے دور ہو جاتی ہے۔ چیونٹیوں کی موت پر، بلند آہنگ اعلان نشر ہوتا ہے نہ بین ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہ کئی کئی دن مرگ بر ہم نفساں کے سوگ میں اپنے بلوں میں سر جھکائے بیٹھ رہتی ہیں۔ وہ اس المناک حقیقت سے اچھی طور پر واقف ہیں کہ موت اٹل ہے، اور زندگی وہ ذمے داری ہے جو ہر چند ہمارے منشا اور اہلیت کو ملحوظ رکھے بغیر ہمیں سونپ دی گئی ہے مگر اس ذمے داری کا نبھانا بہر طور ضروری ہے۔ موت کو سہارنے کی کوئی نہ کوئی صورت ہونی چاہیے! موت کے زخم کو بہر حال بھرنا ہے اور کوئی زخم جتنی جلدی بھر جائے اچھا ہے!!

خوشی

خوشی دو طرح کی ہوتی ہے ایک ہاہو، دوسری فقط ''ہو''۔ ایک لہو و لعب، دوسری سکوت محض۔ ایک پہاڑی جھرنے کی پر شور لہر، دوسری میدانی ندی کا آبِ ست رو۔ ایک ارد گرد کو اپنی چنگھاڑ کی طرف متوجہ کرتی اور دوسری اپنی طرف متوجہ رہتی ہے۔ ایک دنیا کے تعاقب میں، دوسری کے تعاقب میں دنیا ایک ہر جگہ اور شاید ہر پل موجود، دوسری کہیں کہیں اور کم کم موجود۔ ایک آدمی کی منتظر تو دوسری کا منتظر آدمی! ایک راستہ روکے کھڑی اور راستے میں پڑی ہے، دوسری ایک نیا راستہ دکھاتی ہے۔ ایک ویشیا کی طرح جذبات بھڑکاتی ہے دوسری دیوی کے مانند جذبات میں توازن لاتی ہے۔ ایک آگ، دوسری ستارہ! ایک میں جارحیت، دوسری سرتاپا ملائمت۔

ایک خوشی بدن کی سرحد پر آ کر ختم ہو جاتی ہے دوسری روح کی حد سے شروع ہوتی ہے۔ ایک کی دنیا یہ جہانِ خار و خس، دوسری کی وہ عالم صد امکاں! ایک کو بس اپنی لذت کی خبر اور پروا اور دوسری کو پوری ہستی کی خبر اور پروا! ایک لذتِ لب و دہن کی رسیا اور دوسری لذتِ طلب کی خواہاں! ایک کا مقصود بس عیش، دوسری کی نظر مقصود ہست پر! ایک خودنگر و خود پسند و خودنما، دوسری خودآگاہ و جہاں نما۔

ایک خوشی مل جائے تو اس کے چھن جانے کا دھڑکا رہتا ہے۔ دوسری مل جائے تو ہر شے کے چھن جانے کا خدشہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک کے ساتھ خوف دامن گیر رہتا ہے تو دوسری کا ساتھ ہر خوف میں دست گیر ہوتا ہے۔ ایک کی سرشت بے وفائی تو دوسری کی فطرت میں محافظت و نگہبانی

ہے!

ایک خوشی کا مزاج سیلابی ہے، اور دوسری کی صفت سیرابی ہے۔ پہلی سیل آب بن کر آتی مگر اپنے پیچھے ویرانی کے مناظر چھوڑ جاتی ہے۔ دوسری کنوئیں کے پانی کی طرح آہستہ آہستہ آدمی کے وجود میں داخل ہوتی ہے اور وجود کی پوری کھیتی کو سیراب کر دیتی ہے۔ ایک کچھ عطا کرتی ہے تو بہت کچھ چھین لیتی ہے دوسری صرف عطا کرتی ہے۔ ایک کی عطا بالآخر خفت ہے، دوسری کی عطا صرف مسرت ہے۔

ایک خوشی آنکھیں بند کر لینے میں ہے اور دوسری اندر کی طرف آنکھیں کھول لینے میں ہے۔ ایک تلخ و ناگوار کی طرف سے آنکھیں بند کرتی ہے اور دوسری تلخ و ناگوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے۔ ایک پیچھا چھڑانے پر مائل اور دوسری سامنا کرنے پر آمادہ۔ ایک کا وغم سے گھبرانے کا نتیجہ، دوسری کو وغم سے ٹکرا جانے کا ثمر۔ ایک غم کو اپنا دشمن سمجھتی اور اس سے چھپتی اور بھاگتی ہے۔ دوسری غم کو سمجھتی ہے، اس لیے غم کا سامنا کرتی ہے۔ ایک چیختی اور دوسری جھیلتی ہے۔ غم پہ چیخنا طفلانہ فعل اور غم کو جھیلنا صوفیانہ عمل ہے۔ چیخنے والے ہمدردی پاتے اور جھیلنے والے محبت پاتے ہیں۔ ایک کی قسمت میں فقط دو بول اور دوسری کی تقدیر میں ایک پورا جہاں، جہان مسرت

-

ایک خوشی نے دست طمع دراز کر رکھا ہے اور دوسری نے دست دعا! ایک چیزوں اور لوگوں کے پیچھے بھاگتی، ان میں خود کو تلاش کرتی ہے۔ یہ کبھی سیر نہیں ہوتی۔ ایک شے سے اکتاتی ہے تو دوسری کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے لگتی ہے۔ کسی ایک مرکز کا طواف کرتے چلے جانا اسے منظور ہی نہیں۔ یہ اشیا اور لوگوں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتی ہے۔ اس کے لیے شے کی قیمت اور حیثیت بس یہی ہے کہ وہ کسی خاص لمحے میں لذت کام و دہن میں صرف ہو جائے۔ یہ مزاجاً صارفیت پسند ہے اس کی نظر میں شے خود اہم نہیں اپنے فوری اور وقتی مصرف کی وجہ سے اہم ہے! دوسری کو اشیا کی نہیں' خود کی تلاش ہے اور خود کی تلاش میں بھاگنا اور ہانپنا نہیں، بس جلنا پڑتا ہے اور وہ بھی کسی اور کی آگ میں نہیں، اپنی آگ میں۔ دوسروں کی آگ میں جلنے والے بھسم ہوتے مگر اپنی آگ میں جلنے والے صیقل ہوتے ہیں۔

ایک خوشی صرف زندگی سے وابستہ اور اس کے باوجود مطمئن ہے۔ دوسری زندگی کی

معرفت سے وابستہ اور اسی لیے مطمئن ہے۔ ایک موجود کو اوّل و آخر گردانتی اور دوسری موجود کو اوّل تا آخر جاننا چاہتی ہے۔ ایک کے نزدیک لمحہء حاضر سے باہر کچھ نہیں اور دوسری کی نظر میں لمحہء حاضر ہی سب کچھ نہیں۔ ایک آکٹوپس کی طرح ''موجود'' کو جکڑ لینا چاہتی ہے دوسری موجود ونا موجود کو احاطہء نظر میں لانا چاہتی ہے۔ ایک زندگی سے جس شدت سے وابستہ ہے، اسی شدت سے موت سے خوفزدہ بھی ہے۔ اسے ہردم اپنے اور زندگی کے چلے جانے کا دھڑکا یا واہمہ لگا رہتا ہے۔ اس کی لذت میں ایک کسک اور اس کی حلاوت میں ایک ہلاہل شامل رہتا ہے۔ ایک خوشی زندگی کو وہ شعلہ سمجھتی ہے جو بجھ جائے تو پھر روشن نہیں ہوتا مگر دوسری خوشی زندگی کو دریا خیال کرتی ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا، وہ بس مڑتا رہتا اور نئی سمتیں پکڑتا رہتا ہے۔

ایک خوشی بس جمع کرتی ہے اور اس ہوس میں چھیننے اور جھپٹنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ بنیے کی طرح پائی پائی کا حساب رکھتی ہے۔ وہ زندگی کو سود و زیاں میں تولتی اور صرف ''سود'' کو عزیز رکھتی ہے۔ دوسری خوشی جو جمع کرتی اسے تقسیم کر ڈالتی ہے۔ جو مل جائے اسے بانٹ دیتی اور جو نہ ملے اس کا ملال نہیں کرتی۔ پہلی کو صرف اپنا خیال ہے مگر دوسری کو فقط اوروں کا دھیان رہتا ہے!!

☆☆☆

چھوٹا، بڑا اور خالص آدمی

عام خیال ہے کہ آدمی، آدمی ہوتا ہے، چھوٹا نہ بڑا! ذرۂ خاکی ہو کہ ستارۂ فلک، وہ آدمی ہی ہے۔ وہ زربفت میں ملبوس ہو یا گدڑی میں، تختِ شاہی پر براجمان ہو کہ گلیوں کا تنکا، اس کی خاکی نہاد میں کوئی فرق نہیں آتا، مگر مجھے اصرار ہے کہ آدمی چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ کبھی چھوٹا ہوتا ہے اور کبھی بڑا، اور کبھی کبھی معجزہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے چھوٹے پن اور بڑے پن سے نجات پا کر خالص آدمی کے مرتبے پر بھی فائز ہو جاتا ہے اور معجزے چوں کہ خال خال ہی رونما ہوتے ہیں، اس لیے دنیا میں چھوٹے اور بڑے آدمیوں کی کثرت مگر خالص آدمی کی قلت ہے!

چھوٹا آدمی، پروانہ صفت اور بڑا آدمی شمع کے مانند ہے۔ چھوٹا آدمی کسی رہنما، گرو یا کمانڈر کی اطاعت میں خوش ہوتا ہے اور بڑا آدمی اپنے گرد متعدد چھوٹے آدمیوں کی فوجِ ظفر موج دیکھنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمی کی خوشی اپنے گرو کی رضا پر خود کو قربان کرنے میں اور بڑے آدمی کا اہتزاز اپنے سامنے خمیدہ سروں کو دیکھنے اور انھیں برابر خمیدہ رکھنے میں ہے۔ چھوٹے آدمی کا اندر بڑے آدمی کی رضا طلبی سے بھرا ہوتا ہے جبکہ بڑے آدمی کا دماغ فقط طاقت و اختیار کے حصول کے عزائم سے لبریز ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی ویسے تو محسوس بھی کرتا ہے اور سوچتا بھی ہے مگر اپنے لیے نہیں: اس کے احساس کے تار بڑے آدمی کی خوشنودی سے جڑے ہوتے ہیں اور اس کی سوچ بڑے آدمی کے ارادوں کی تکمیل کی آلہ کار ہوتی ہے۔ چھوٹا آدمی وہ ہے جو اپنے آپ سے بہت فاصلے پر اور کسی بڑے آدمی سے اتنا ہی نزدیک ہے۔ چھوٹے آدمی کی سرشت، جاں نثاری

اور بڑے آدمی کی فطرت، جاں طلبی ہے۔ سو بڑا آدمی، چھوٹے آدمیوں کے حسبِ ضرورت چھوٹی بڑی قربانیوں کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ چھوٹا آدمی اس بات پر خوش کہ اس کی زندگی کام آئی، رائیگاں نہ گئی، اور بڑا آدمی اس لیے مسرور کہ چھوٹے آدمی کی حیاتِ مختصر اس کے کام آئی۔ بڑا آدمی قصرِ عالی شان کے مانند ہے جس کی ہر دیوار کو چھوٹے آدمیوں کے دست و بازوؤں نے سہارا دے رکھا ہے۔ بڑے آدمی کے بڑا ہونے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی نگاہ ان کے دست و بازو پر پڑنے نہیں دیتا۔ بڑا آدمی اس فن میں طاق ہوتا ہے کہ چھپایا کیا جائے اور نمائش کی جائے تو کس کی۔ کسے پس منظر میں اور کسے منظر میں رکھا جائے!

چھوٹا آدمی یہ نہیں جانتا کہ وہ چھوٹا ہے، اس لیے یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ بڑا کیوں نہیں۔ وہ اس سے بھی بے خبر ہے کہ بڑا آدمی اس کی وجہ سے بڑا ہے۔ وہ اپنے اندر کی آوازیں نہیں سنتا اور جو اندر کی آوازیں نہیں سنتا اسے باہر کی آوازیں سننا پڑتی ہیں۔ اندر کی صدا میں محبت کی سرگوشی اور سپردگی کی سی کیفیت ہوتی ہے اور باہر کی آواز میں تحکم اور جلال ہوتا ہے۔ جس آدمی کے باطن پر مسلسل باہر کی آوازوں کی ضرب پڑتی رہے وہ بے چون و چرا حکم بجالانا چاہتا ہے اور بس! وہ اس بات سے بے خبر رہتا ہے کہ اندر دیوتا بستے ہیں۔ اس کی بے خبری اسے دیوتا کو باہر تلاش کرنے کے دھوکے میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سو وہ کبھی کسی پتھر یا کسی شجر اور کبھی اپنے ہی کسی بھائی بند کو دیوتا بنا لیتا ہے اور اندر کے دیوتا کی کبھی کسی کو خبر ہو بھی جائے تو اس سے بے خبر رہنے ہی میں عافیت سمجھی جاتی ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے کشٹ اٹھانا پڑتے ہیں۔ اپنے باطن کے بے کراں تاریک کرے میں تنہا اترنا پڑتا ہے۔ ہر قدم سانس روک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ اور ہر قدم پر ابھرنے والی چاپ پر دھیان کو مرکوز کرنا پڑتا ہے اور لوگ سہل پسند ہیں، اس لیے وہ اپنے اندر کو قبلہ بنانے کے بجائے کسی باہر کے دیوتا کے قدموں میں ڈھیر ہونے کو دوڑے چلے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جسے وہ دیوتا سمجھ رہے ہیں وہ اس لیے دیوتا ہے کہ اسے انھوں نے دیوتا کہا ہے۔ باہر کے دیوتا کی ساری شکتی اسے دیوتا ماننے والوں کے دم سے ہے۔

چھوٹا آدمی خواب نہیں دیکھتا، فقط بڑے آدمی کو دیکھتا ہے اور بڑا آدمی چھوٹے آدمیوں کو بروئے کار لا کر اپنے دو جہاں سنوارتا ہے۔ چھوٹے آدمی کی خوشی اس میں ہے کہ وہ کسی بڑے آدمی کے تراشے ہوئے راستے پر چلے اور اطمینان اس میں کہ اسے اس راستے پر کوئی چوٹ نہ آئے

اور تفاخر اس میں کہ بڑا آدمی اس راستے پر چلنے کے صدقے اسے اپنے حلقہ ء ارادت میں شامل سمجھے ۔ ادھر بڑے آدمی کی مسرت نئے راستے دریافت کرنے میں اور تفاخر اس میں کہ کئی چھوٹے آدمی اس پر گامزن ہیں ۔ بڑا آدمی ، اقوال تخلیق کرتا ہے اور چھوٹا آدمی انھیں نقل کرتا ہے ۔ چھوٹا آدمی صلاحیتوں کو دوسروں کی کہی ہوئی باتیں یاد رکھنے میں صرف کرتا ہے اور بڑا آدمی یاد رکھے جانے کے قابل باتیں کہنے کی دھن میں رہتا ہے ۔ سو چھوٹا آدمی ، باتونی اور بڑا آدمی ، کم گو ہوتا ہے ۔ چھوٹے آدمی کے پاس چوں کہ اپنی کوئی بات نہیں ہوتی ، اس لیے اسے اپنی کہی ہوئی بات کے وزن کا بھی علم نہیں ہوتا ۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ اس جیسے چھوٹے آدمیوں کی باتیں ہی ہیں جو اس جیسے آدمی کو بڑا بنا رہی ہیں ۔ بہت سے چھوٹے آدمیوں کی ایسی باتیں ، پستہ قامتوں کو دیو قامت بنا ڈالتی ہیں ۔ باتیں بڑا آدمی بھی پسند کرتا ہے مگر ایسی باتیں جو اس کے بارے میں کہی جائیں ۔ وہ اوروں سے باتیں کرنے کے بجائے انھیں باتوں میں لگا تار زیادہ پسند کرتا ہے ۔ سو ہر بڑا آدمی وقتاً فوقتاً اس تاک میں رہتا ہے کہ وہ '' ٹاک آف دا ٹاؤن '' بنا رہے ۔ بڑا آدمی خبر بنتا ہے اور چھوٹا آدمی خبر پڑھتا ہے ۔

چھوٹا نہ بڑا ، آدمی خالص بھی ہوتا ہے !

خالص آدمی وہ ہے جو نہ چھوٹے آدمی کی طرح اپنی فطرت کو مسخ کرتا ہے نہ بڑے آدمی کی مانند فطرت کا استحصال کرتا ہے ۔ وہ بس فطرت کی حفاظت کرتا ہے ۔ چھوٹا آدمی ، نافہمی میں مارا جاتا ہے اور بڑا آدمی تیز فہمی کا مارا ہوا ہوتا ہے ۔ جبکہ خالص آدمی درست فہمی کی نعمت سے سرفراز ہوتا ہے ۔ سو وہ اپنی آنکھوں کو پورے طور پر وا رکھتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھتا اور سہتا ہے جو موجود ہے ۔ چھوٹا آدمی اپنی نفی اور بڑا آدمی اپنا اثبات کرتا ہے مگر خالص آدمی پورے '' موجود '' کا اثبات کرتا ہے ۔

خالص آدمی کئی منطقوں میں زندگی جیتا ہے ۔ بدن ، ذہن ، اور ماورائے ذہن منطقوں میں ۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی اپنا اظہار جسم میں کرتی ہے ۔ اپنی حکمت عملیوں کو ذہن میں منکشف کرتی ہے اور اپنے اسرار کو ماورائے ذہن منطقوں میں نہاں رکھتی ہے ۔ چناں چہ وہ بدن کے جمال کا قصیدہ پڑھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے ؛ فطرت کی حکمت عملیوں کو سمجھنے میں مسرت پاتا ہے ۔ اور اسرار حیات کے کشف میں نشاط محسوس کرتا ہے ۔ خالص آدمی نہ راہب ہوتا ہے نہ نرا لذت پسند اور

نہ محض فلسفی! وہ بس ایک خالص آدمی ہوتا ہے۔ زندگی کی سب صورتوں اور سطحوں سے وابستہ...... کہیں حواس کی سطح پر، کہیں خیال کی رو سے اور کہیں ماورائے خیال کے تار سے! اس پر خلوت بھاری ہوتی ہے نہ جلوت! وہ صحبت ہم نفساں میں جتنا خوش ہوتا ہے اتنا ہی مسرور صحبت خود میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی صحبت، صحبتِ غیر نہیں ہوتی!

چھوٹا آدمی صرف حال میں بڑا آدمی کچھ حال اور تھوڑا مستقبل میں، جبکہ خالص آدمی تینوں زمانوں میں جی رہا ہوتا ہے۔ پہلا تقدیر پرست، دوسرا ارادیت پسند اور تیسرا انسانیت پسند ہوتا ہے۔ چھوٹا آدمی قبول کرتا، بڑا آدمی حاصل کرتا، اور خالص آدمی محبت کرتا ہے۔

چھوٹا آدمی بظاہر سوچتا اپنے لیے اور کرتا دوسرے کے لیے ہے۔ بڑا آدمی دوسروں کے لیے سوچنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر کرتا اپنے لیے ہے، جبکہ خالص آدمی زندگی کو سوچتا اور زندگی کے لیے کرتا ہے! چھوٹا آدمی کنزیومر، بڑا آدمی پروڈیوسر اور خالص آدمی کری ایٹر ہوتا ہے۔

تاریخ کے متن پر بڑا آدمی چھایا ہوا ہے۔ چھوٹا آدمی تاریخ کے حاشیے پر اور خالص آدمی تارخ میں موجود ہی نہیں، وہ صرف دلوں میں اور فلسفی کے خوابوں میں، اور بڑے شاعروں کی نظموں میں ہے!!

☆☆☆

خبر کی بھوک

آدمی خبر کا بھوکا ہے۔ شکم کی بھوک نے گندم اگائی تو خبر کی بھوک نے صحافی نام کی مخلوق کو جنم دیا۔ جس طرح گندم ذخیرہ اندوزوں اور سرمایہ داروں کے ہتھے چڑھ گئی، اُسی طرح خبر پر اخبار، ٹی وی، انٹرنیٹ نے قبضہ جمالیا۔ خبر اور شکم کی بھوک نے ایک جیسی تقدیر پائی۔ گندم اور خبر کی فراوانی کے باوجود، دونوں کی بھوک بدستور موجود ہے۔

فراوانی حجاب ہے اور ہر حجاب ایک معما ہے۔ خبر کی فراوانی نے اِسے حجاب اندر حجاب چھپالیا اور اِس کے وجود کو ایک پہیلی بنا ڈالا ہے۔ خبر ہر سُو دندناتی پھر رہی ہے؛ مگر اپنی اصل خبریت کے بغیر۔ گویا جس طرف نظر اُٹھائیں، آپ کو سبزہ ہی سبزہ نظر آئے مگر بہار کا نام ونشان نہ ہو: رنگ، نور، نکہت نہ ہو، بس گیاہ و سبز کا 'سو بہ سُو استبداد ہو۔ واقعات ہمیشہ، ہر وقت، ہر جگہ ہُوا کرتے تھے؛ مگر کسی کسی واقعے کے سر پر خبر کا تاج سجایا جاتا۔ جس طرح ہر شخص ایڈی پس نہیں ہوتا تھا کہ سفنکس کے سوالوں کا جواب دے کر تھیبس کا بادشاہ بن سکے، اُسی طرح خبر کا ہما بھی ہر واقعے کے سر پر نہیں بیٹھتا تھا۔ یہ تو سمجھا جاتا تھا کہ خبر واقعے کے اندر سے جنم لیتی ہے؛ مگر یہ عقیدہ بھی عام تھا کہ ہر واقعے کی سرزمین اِس قدر زرخیز نہیں ہوتی کہ خبر کی فصل اگا سکے۔ اکثر واقعات بنجر ہوتے، یعنی معمولات کا حصہ ہوتے، بس کچھ ہی واقعات حادثے اور سانحے میں بدلنے کی صلاحیت رکھتے، یعنی خبر بنتے، مگر جب صحافی نام کی مخلوق نے خبر کو آدمی کی ہوسِ جستجو کے بجائے اپنی ہوسِ شکم مٹانے

کاذریعہ بنایا تو اِس مخلوق نے ایک نیا فن ایجاد کیا۔ یہ فن دودھاری تلوار کی طرح تھا۔ایک طرف ہر واقعے سے خبر کشید کرنے کا راز دریافت کرلیا گیا اور دوسری طرف پہلے خبر تیار کی، پھر اُسے کسی خاص واقعے پر چسپاں کرنے کا جادوئی ہنر سیکھ لیا گیا۔

اب ہم ایک ایسی دنیا میں جینے پر مجبور ہیں جس میں ہر واقعہ خبر ہے اور ہر خبر کے لیے کوئی نہ کوئی واقعہ منتخب، گھڑیا دریافت کرلیا جاتا ہے۔انسان نے سینکڑوں حیرت انگیز اشیا ایجاد کی ہیں مگر خبر کی ایجاد سے بڑا معجزہ شاید ہی کوئی ہو! خبر میں عجب معجزاتی قوت ہے۔ یہ پل بھر میں اپنے "بنانے والے" اور نشر کرنے والے کی تقدیر بدل دیتی ہے۔خبر نے واقعے کی کایا کلپ بھی کر دی ہے۔اَب واقعہ فقط وہی ہے، جس کی خبر بنے۔ واقعہ خبر کا مقیاس نہیں، خبر واقعے کی کسوٹی ہے۔

ایک زمانہ تھا...... شاید وہ انسانی تہذیب کا سنہری زمانہ تھا کہ خبر، واقعے میں دلچسپی ابھارتی تھی۔ جب لوگوں کو اطلاع ملتی کہ فلاں جگہ تین آدمی قتل ہوئے، حادثے میں ہلاک ہوئے یا اُنھوں نے خودکشی کر لی، تو سب لوگ اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ، وقوعے کے مقام پر پہنچتے۔ مرنے والوں کے نام، کام، حالات اور خاندان سے متعلق ہر ممکنہ تفصیل جاننے کی کوشش کرتے اور اس دوران میں وہ ہر مرنے والے سے کوئی نہ کوئی ذاتی تعلق دریافت کر لیتے۔ چناں چہ اُن کا آخری دیدار کرتے ہوئے، اُن کے لیے اشک بار ہوتے، اُن کے لواحقین کی مدد کرتے: اس سارے عمل میں خبر کا کردار محض مطلع کرنے تک محدود ہوتا۔خبر اطلاع فراہم کرنے کا فریضہ ادا کرکے، کسی نامعلوم مقام میں روپوش ہو جاتی اور واقعہ لوگوں کی زندگیوں میں جگہ بنالیتا؛ اُنھیں تبدیل کرتا، کوئی نیا رُخ دیتا؛ لوگ وقت کا تعین کرنے کے لیے اُس واقعے کا حوالہ دیتے۔ یوں واقعات اور اُن کی زد پر آنے والے افراد لوگوں کی شخصیت کا مستقل حصہ بن جاتے...... لیکن اب وہ سنہری زمانہ لد چکا ہے۔خبر نے گویا واقعے کا تختہ الٹ دیا ہے اور اپنی مطلق العنان حکمرانی کا اعلان فرما دیا ہے۔ سیاسی ملوکیت کے زمانے بیت گئے؛ مگر خبر کی ملوکیت کا ڈنکا ہر گھر، دفتر، ریلوے سٹیشن، فضائی اڈے اور ہر بازار میں بج رہا ہے۔آپ چند سیکنڈ کے لیے سڑک کے چوراہے پر رُکتے، سرخ بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرتے ہیں تو ایک نوجوان بھاگا بھاگا آتا ہے: ہاتھ میں دوپہر کا اخبار لہراتے، گلا پھاڑ کے اعلان کرتا ہے، "انقلاب آ گیا"۔آپ جھرجھری لے کر چونک پڑتے ہیں...... یا اللہ خیر، کون سا انقلاب آ گیا، اور آپ کو خبر نہیں؛ آپ کو خبر کی بھوک

سناتی ہے اور آپ پانچ روپے اُس کے ہاتھ پر رکھتے اور وہ آپ کے ہاتھ میں روز نامہ ''انقلاب'' تھما کر اگلی گاڑی کا رُخ کرتا ہے۔ اخبار میں بے حد موٹی سرخی ہے: ''انقلاب آ گیا''۔ الیکشن کا موسم ہے۔ کوئی سیاسی پرندہ چیخ رہا ہے، کوئی چہک رہا ہے اور کوئی سبز خواب دکھا رہا ہے اور کوئی سرخ، سبز انقلاب کی نوید دے رہا ہے۔ ایک دعویٰ، خواب اور امید کیسے خبر ہو گئی۔ آپ نے جو انقلاب پانچ روپے میں خریدا تھا، اُسے اگلے سگنل پر کسی کو مفت دے دیتے ہیں۔ خبر کے ملوکانہ طرزِ عمل کے خلاف اِس سے بڑھ کر احتجاج آپ کیا کر سکتے ہیں! ہاں دل ہی دل میں اخبار چھاپنے والوں، بیانات پر خبر کا رنگ روغن چڑھانے والوں اور خود بیانات داغنے والوں کو دو چار صلواتیں ضرور سناتے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ آپ کی تنہائی میں ''شاہِ خبر'' اور اُس کے درباریوں کو مخل ہونے کا حق کس نے دیا!

ابھی یہ بات آپ سوچ ہی رہے ہوتے ہیں کہ آپ کا دستی فون کسی پیغام کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔ خدا خیر کرے، آپ ڈرتے ڈرتے ''اِن باکس'' کھولتے ہیں۔ ''بوسٹن میں بم دھماکے، فائرنگ۔ کئی ہلاک، متعدد زخمی۔'' آپ کا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ آپ کی تنہائی کو جس ڈریکولا نے خون آشام کیا ہے، وہ تو آپ ہی کے گھر کا بھیدی یعنی آپ کا دستی فون ہے۔ اتنا اختیار تو آپ نے اپنی شریکِ حیات کو نہیں دیا کہ وہ کہیں، کسی بھی وقت اور کسی سرگرمی میں شریک ہونے پر اصرار کرے، مگر آپ کے دستی فون کو یہ اختیار بلا شرکتِ غیرے حاصل ہے...... دنیا میں اگر کہیں کسی جگہ کوئی بڑا واقعہ ہوا ہے تو کیا ضروری ہے کہ آپ تک وہ ضرور پہنچایا جائے! سات ارب انسانوں کی دنیا میں ہر لمحہ کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو رہا ہے۔ خبر کی گلوبلائزیشن نے یہ لازم تصور کر لیا ہے کہ ہمیں ہر پل اور ہر جگہ کی خبر دے۔ اگر ہم رات کو سونے سے پہلے اپنے ذہن کی لوح کا مطالعہ کریں تو وہاں خبروں کی سیاہی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ ان کی فراوانی نے ہم سے وہ مہلت بھی چھین لی ہے کہ ہم اِن پر کسی ردِ عمل کا اظہار کریں۔ ہمارے پاس اِس کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ ہم بے حسی کا جامہ اوڑھ لیں۔ کہیں ہزار آدمی مر گئے، کہیں بڑی عمارت گر گئی، کسی کارخانے میں آگ لگ گئی، کوئی سابق آئرن لیڈی جہان سے رخصت ہو گئی، کہیں اربوں ڈالر اسلحے کی ڈیل ہوئی، کہیں اربوں کی کرپشن پکڑی گئی، ریلوے کا ڈیزل ختم ہو گیا، لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بیس گھنٹے تک پہنچ گیا۔ میں انقلاب لاؤں گا۔ ہم تو انقلاب لا چکے۔ یہ سب انقلاب کہاں لائیں گے، اصل

انقلابی تو ہم ہیں۔ خبروں کا ازدحام ہے اور یہ اکیلی جان! کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں یا آنکھیں بند کر لی جائیں؛ مگر پھر کھلتا ہے کہ خبر نے تو آپ کے باطن تک رسائی کے لیے سیندھ لگا رکھی ہے۔ ذہن کی لوح پر پھیلی سیاہی خبر، دل تک اتر چکی ہے۔ خوابوں میں اب پریاں نہیں، خبروں میں سنی اور دیکھی ہوئی منحوس صورتیں نظر آتی ہیں۔ آدمی اپنی تضحیک پر احتجاج کر سکتا ہے؛ مگر خواب کی تضحیک پر تو بس ایک لمبی چپ ہی اختیار کی جا سکتی ہے..... کیا لمبی چپ بھی احتجاج ہی کی ایک صورت نہیں ہے..... کیا اس احتجاج کی خبر بھی کسی اخبار یا چینل پر آئے گی!!

چراغ آفریدم

نئی نسل کے ذہین اور صاحب مطالعہ نقاد ناصر عباس نیرّ کا انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہونا باعثِ مسرت ہے کیوں کہ انشائیہ ایسی صنف اُدب ہے جس میں مطالعہ ومشاہدہ کے ثمرات بطریقِ احسن سمیٹے جا سکتے ہیں۔ مطالعہ ومشاہدہ جتنا گہرا ہو، انشائیہ اتنا ہی تہ دار اور پہلو دار ہوتا ہے۔

تنہائی سے مکالمہ اور فطرت سے معانقہ ناصر عباس نیرّ کے انشائیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ وہ جب تنہائی میں مظاہر فطرت اور انسانی خصلت پر غور کرتا ہے تو ساری کائنات اس کے اندر سمٹ جاتی ہے، اور وہ انسان اور فطرت کے ازلی روابط سے آشنا ہونے کے بعد اُسی طرح وجد میں آتا ہے جس طرح ایک صوفی عالمِ استغراق میں ایک نئی حقیقت پا لینے کی مسرت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس وَجد کے عالمِ استغراق میں وہ جب اپنے محسوسات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو قاری بھی اس کے تجربے میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی ایک اچھے انشائیے کی خوبی ہے۔

بشیر سیفی

ناصر عباس نیرؔ کی تنقید میں انفرادیت، تازگی اور نکتہ آفرینی ہے۔ وجہ یہ کہ وہ نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تخلیق کار بھی ہے۔ اس نے متعدد نہایت عمدہ انشائیے تخلیق کیے ہیں اور اس عمل کے دوران میں اپنی ذات کے اس منطقے کو بار بار چھوا ہے جو تخلیق کاری کا منبع اور مخزن ہے۔ تخلیق کاری کے اس وظیفے نے اس کی تنقید کو تو فائدہ پہنچانا ہی تھا، سو پہنچایا لیکن خود اُردو کو بھی اس سے بڑی تقویت ملی ہے۔ آپ ناصر عباس نیرؔ کے اِنشائیے پڑھیں تو آپ کو معمولی چیزوں اور افعال میں ایک جہانِ معنی نظر آئے گا۔ صنفِ انشائیہ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ان گری پڑی چیزوں کو فرشِ خاک سے اٹھا لیتی ہے جنھیں ہماری ادبی اشرافیہ نے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا تھا اور پھر انھیں جھاڑ پونچھ کر کیا سے کیا بنا دیا ہے! انشائیہ نگاری کا یہی عمل نقاد کو بھی اِس بات پر مائل کرتا ہے کہ وہ اُن نام نہاد لکھاریوں سے متاثر نہ ہو جو میک اَپ کے رسیا اور نمائش کے دلدادہ ہیں بلکہ ان تخلیق کاروں پر توجہ مبذول کرے جن کی گُودڑیوں میں لعل چھپے ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھیں تو ناصر عباس نیرؔ نے جو نہ صرف زندہ رہنے والے اِنشائیے تخلیق کیے ہیں بلکہ اس صنفِ ادب کے طریقِ کار کو برت کر اپنی تنقید کو بھی تخلیقی سطح تفویض کر دی ہے۔

وزیر آغا

بیکن بُکس

• غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون 042-37320030
• گلگشت ملتان فون 061-6520790, 6520791

beaconbooks786@gmail.com
www.beaconbooks.com.pk